جون ایلیا
گویا

کہتے ہیں جس کو ذات وہ گویا کہیں نہیں
دنیا میں دیکھ آئے، یہ ذرہ ذرا کہیں نہیں

— جون ایلیا

جونؔ ایلیا

ناشر:

تخلیق کار پبلشرز

104/B — پہلی منزل، ٹی بلاک، لکشمی نگر، دہلی-۱۱۰۰۹۲

انتساب

جونؔ ایلیا کے "محرم" دوست

معروف شاعر

سیّد حسن عابد مرحوم

کے نام

اشاریہ

قطعات

نظمیں

ہوئے سے وہ گئے تھے اور جون ایلیا خود بیاں کرتے تھے کہ وہ "شاید" کو ان اشعار کے ساتھ
شائع کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ جو کسی جلدی "شاید" کے اضافی ایڈیشن میں ان اشعار سے
محفوظ ہو سکیں گے۔

اب مسئلہ اس دستیاب شدہ کلام کا اس شکل میں لانے کا تھا کہ وہ شائع ہو سکے۔ بیشتر کاغذ
بوسیدہ ہونے کی وجہ سے پھٹ رہے تھے۔ ان کے الفاظ کہیں کہیں سے مٹ چکے تھے جس کی
وجہ سے اشعار کے شائع ہونے کا امکان نہ تھا۔ کچھ غزلوں کے کئی کئی (VERSIONS)
تھے جن میں زیادہ موزوں اور جامع کا انتخاب کرنا تھا۔ اس مشکل صورتحال کو دیکھتے ہوئے
میں نے جون ایلیا کے لڑکپن کے دوست محترم پروفیسر سحر انصاری سے مدد کرنے کی درخواست
کی۔ سحر بھائی خود اپنی آنکھوں اور صحت کی ناسازی کی وجہ سے کافی پریشان تھے مگر میری
درخواست اور اصرار کو دیکھتے ہوئے بالآخر راضی ہو گئے۔ پروفیسر سحر انصاری نے اپنے دوست اور
جون ایلیا کے ساتھی واقف کے دنوں کے ساتھ بزرگ رفیق کار محترم سید علی قاصد زیدی
صاحب کے ساتھ مل کر ان پھٹے اور مٹے ہوئے اشعار کو پڑھنے میں میری مدد کی اور انھیں
شائع ہونے کے قابل بنایا اور ساتھ ہی اس مجموعہ "گویا" کے کلام کو بھی دیکھ کر کہیں کہیں کی غلطی کا
احتمال دور کر دیا۔ جون ایلیا کی رثائی نظم "مرگ ناگہانی" پر محترم سحر انصاری کا مضمون
"مرگ ناگہانی" خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ ان دونوں محترم حضرات کی مدد کے بغیر میں اس
کلام کو قابل اشاعت حالت میں نہیں لا سکتا تھا۔

محترم سید علی قاصد زیدی، محترم پروفیسر سحر انصاری، محترم علامہ علی کرار نقوی،
محترم شیخ محمد ولی داد ولی اور محترم ڈاکٹر خورشید عبداللہ کے اس بے لوث تعاون کی بدولت
اردو شاعری کو یہ قیمتی سرمایہ محفوظ ہو گیا ہے۔ محترم جناب ممتاز سعید (محسن بھائی) نے
آخری لمحوں میں اس مجموعہ کی پروف ریڈنگ میں شریک ہو کر اپنا کردار ادا کیا۔ برادر محترم
سید نسیم ساجد کرمانی اور برادر عزیز آغا ناظم کا ساتھ اور جون ایلیا کے ماموں ڈاکٹر سید [illegible]
محترمہ [illegible] قریشی، محترمہ [illegible] (امی) اور [illegible] میں قیام پذیر
جناب سید [illegible] علی کی مدد بھی تھی جو اس مجموعہ میں شامل رہی جس کے لیے میں ان سب

○

مندر ہو مسجد یا دیر، سب کا بھلا ہو، سب کی خیر
ہے یہ انسانوں کی سیر، سب کا بھلا ہو، سب کی خیر

ایک محبت جو بیچ میں ہے، اس کا رونا روئے کون
سب ہیں اپنے آپ سے غیر، سب کا بھلا ہو، سب کی خیر

آپ تو اور بھی ڈرتے ہیں، یار میاں ان شہروں سے
دل جنگل کے وحشی و طیر، سب کا بھلا ہو، سب کی خیر

میرے سارے قاتل مجھ پہ جان و دل سے عاشق تھے
میں نے ہی خود کو مارا غیر، سب کا بھلا ہو، سب کی خیر

○

یاد آؤ گے، یاد کریں گے، جانے کیا کچھ ٹھیری تھی
ہجر کے غم آباد کریں گے، جانے کیا کچھ ٹھیری تھی

دھیان لگا کر بیٹھیں گے ہم لوگوں سے فرصت پا کر
وعدوں کی امداد کریں گے، جانے کیا کچھ ٹھیری تھی

جو لمحہ بھی بیت رہے گا، دل لمحوں کے رشتوں سے
وہ لمحہ برباد کریں گے، جانے کیا کچھ ٹھیری تھی

غم لکھوا دو گی ہر خسرو کو، رشکِ شیریں بن کر
ہم کارِ فرہاد کریں گے، جانے کیا کچھ ٹھیری تھی

جب ہونٹوں پہ لگ جائے گا پہرا، تو ہم بھی آخر
سینے میں فریاد کریں گے، جانے کیا کچھ ٹھیری تھی

ہجر میں جب کر نہ سکیں گے، شام ملال مجبوری
سانسوں کو برباد کریں گے، جانے کیا کچھ ٹھیری تھی

جب تنہائی میں تنہائی، پا نہ سکیں گے چار طرف
اس کو ہم ایجاد کریں گے، جانے کیا کچھ ٹھیری تھی

خون ہی تھوکیں گے ہم جانم، جانم جاناں، جانم جاں
یعنی تمہیں آزاد کریں گے، جانے کیا کچھ ٹھیری تھی

جب تعبیر خواب نہ ہوگی، آنکھوں کی دل بستی میں
خود کو بے بنیاد کریں گے، جانے کیا کچھ ٹھیری تھی

○

اب تو اک خواب ہوا اذنِ بیاں کا موسم
جانے کب جائے گا، یہ شورِ اذاں کا موسم

حاکمِ وقت ہوا ہے، حاکمِ فطرت شاید
ان دنوں شہر میں، نافذ ہے خزاں کا موسم

حکمِ قاضی ہے کہ ماضی میں رکھا جائے ہمیں
موسمِ رفتہ رہے، عمرِ رواں کا موسم

خم بادہ کا نہیں نام و نشاں اور یہاں
ہے شرر بار، فقیہوں کی زباں کا موسم

کعبۂ دل پہ ہے ویران حرم کی یلغار
ہائے اے پیرِ مغاں! تیری اماں کا موسم

بند ہیں دید کے در، وا نہیں امید کے در
ہے یہ ویراں شہر میں خوابوں کے زیاں کا موسم

اک نہیں ہے کہ ترے لب سے سنی جاتی ہے
جانے کب آئے گا، ظالم! تری ہاں کا موسم

وا نہ کر بندِ قبا، ہاں کی ہوا میں اپنے
نشۂ سرمست! مسلماں ہے یہاں کا موسم

رنگ سرشار نہ ہو جائے فضا تو کیا
آئے تو مستیٔ خونیں نفساں کا موسم

تو ہے جن کی جان انھیں کی، تجھ کو نہیں پہچان جگن
تجھ پہ میری جان نچھاور، اے میرے انجان جگن

دھند ہے دیکھے سے ان دیکھے تک، دیکھے ان دیکھے کی
اور اس دھند میں ہے اب میرے دھیان میں بس اک دھیان جگن

میری ذات اب اک زنداں ہے، دل ہے اس کا زندانی
تو ہے میری ذات کے اس، زندانی کا ارمان جگن

یہ جو ہم دو چار بچے ہیں، نام ترا جپنے والے
ہو سکتا ہے کچھ کر گزریں، بات ہماری مان جگن

ایسے فسادی بھی ہوتے ہیں، سوچ کے میں حیران ہوں میں
بیچ میں پڑنے والے نکلے، کیسے بے ایمان بھی

چاہ کا ناتا کیسے نبھے گا، کیسے بات بنے گی جان
میں نے کیا کچھ ٹھان رکھا ہے، تو بھی تو کچھ ٹھان بھی

ویرانوں میں کوئی نہیں جو آنکلے اور دھوم مچے
ویرانوں کی ویرانی سے، شہر ہوئے ویران بھی

○

طلسمی سرزمیں ہے، جانے کیا ہو
یہاں کچھ بھی نہیں ہے، جانے کیا ہو

عجب ہی کچھ ہے اس بستی کا انداز
کچھ اندازہ نہیں ہے، جانے کیا ہو

کبھی اک شور اٹھتا تھا پہ اب کے
خموشی، نکتہ چیں ہے، جانے کیا ہو

گراں ہے اب یہاں جنسِ گماں بھی
وہ افلاسِ یقیں ہے، جانے کیا ہو

جدا ہیں ہم اور نہیں تابِ جدائی
ابھی تک دل وہیں ہے' جانے کیا ہو

ٹھہر' اشکِ سرِ مژگانِ جاناں!
یہ میری آستیں ہے' جانے کیا ہو

یہ ہنگامِ تلاطم تھا مگر دل
تلاطم تہ نشیں ہے' جانے کیا ہو

ہیں کچھ قصے یہاں اس کے سوا بھی
اسے آنا نہیں ہے' جانے کیا ہو

کسی کے عارضوں میں دل ہمارا
عبارت آفریں ہے' جانے کیا ہو

چلے تو آئے ہو تم پہ مری جاں
وہ در' اب بے جبیں ہے' جانے کیا ہو

یونہی دل صبح سے اندوہگیں ہے
بہت اندوہگیں ہے' جانے کیا ہو

ہم جی رہے ہیں کوئی بہانہ کیے بغیر
اس کے بغیر، اس کی تمنا کیے بغیر

انبار اس کا پردۂ حرمت بنا میاں
دیوار تک نہیں گری، پردہ کیے بغیر

یاراں! وہ جو ہے میرا مسیحائے جان و دل
بے حد عزیز ہے مجھے، اچھا کیے بغیر

میں بستر خیال پہ لیٹا ہوں اس کے پاس
صبح ازل سے کوئی تقاضا کیے بغیر

اس کا ہے جو بھی کچھ ہے مرا اور میں مگر
وہ مجھ کو چاہیے، کوئی سودا کیے بغیر

یہ زندگی جو ہے اسے معنی بھی چاہیے
وعدہ ہمیں قبول ہے، ایفا کیے بغیر

اے قاتلوں کے شہر! بس اتنی ہی عرض ہے
میں ہوں نہ قتل، کوئی تماشا کیے بغیر

مرشد کے جھوٹ کی تو سزا بے حساب ہے
تم چھوڑیو نہ شہر کو، صحرا کیے بغیر

ان آنکھوں میں کتنا سکون و سرور تھا
آرائش نظر تری، پروا کیے بغیر

یاراں! خوشا یہ روز و شب دل کہ اب ہمیں
سب کچھ ہے خوشگوار، گوارا کیے بغیر

گریہ کناں کی فرد میں اپنا نہیں ہے نام
ہم گریہ کن ازل کے ہیں، گریہ کیے بغیر

آخر ہیں کون لوگ جو بخشے ہی جائیں گے
تاریخ کے حرام سے، توبہ کیے بغیر

تھی وہ کون تھا، جس کی جفا نے جونؔ
شیعہ بنا دیا ہمیں، شیعہ کیے بغیر

اب تم کبھی نہ آؤ گے، یعنی کبھی کبھی
رخصت کرو مجھے، کوئی وعدہ کیے بغیر

○

دل نے کیا ہے قصدِ سفر، گھر سمیٹ لو
جانا ہے اس دیار سے، منظر سمیٹ لو

آزادگی میں شرط بھی ہے احتیاط کی
پرواز کا ہے اذن، مگر، پَر سمیٹ لو

حملہ ہے چار سو در و دیوار شہر کا
سب جنگلوں کو شہر کے اندر سمیٹ لو

بکھرا ہوا ہوں صرصرِ شامِ فراق سے
اب آ بھی جاؤ اور مجھے آکر سمیٹ لو

رکھتا نہیں ہے کوئی نگفتہ کا یاں حساب
جو کچھ ہے دل میں اس کو لبوں پر سمیٹ لو

○

حالتِ حال کے سبب، حالتِ حال ہی گئی
شوق میں کچھ نہیں گیا، شوق کی زندگی گئی

تیرا فراق جانِ جاں، عیش تھا کیا مرے لیے
یعنی ترے فراق میں، خوب شراب پی گئی

تیرے وصال کے لیے، اپنے کمال کے لیے
حالتِ دل کہ تھی خراب، اور خراب کی گئی

ایک ہی حادثہ تو ہے اور وہ یہ کہ آج تک
بات نہیں کہی گئی، بات نہیں سنی گئی

بعد بھی تیرے جانِ جاں، دل میں رہا عجب سماں
یاد رہی تری یہاں، پھر تری یاد بھی گئی

اس کے بدن کو دی نمود ہم نے سخن میں اور پھر
اس کے بدن کے واسطے، ایک قبا بھی سی گئی

مینا بہ مینا، مے بہ مے، جام بہ جام، جم بہ جم
ناف پیالے کی ترے، یاد عجب سہی گئی

کہنی ہے مجھ کو ایک بات آپ سے یعنی آپ سے
آپ کے شہرِ وصل میں، لذتِ ہجر بھی گئی

صحنِ خیالِ یار میں، کی نہ بسر شبِ فراق
جب سے وہ چاندنا گیا، جب سے وہ چاندنی گئی

○

نمو: شوق رنگ میں، تجھ سے جدائی کی گئی
ایک لکیر خون کی، بیچ میں کھینچ دی گئی

تھی جو کبھی سر سخن، میری وہ خامشی گئی
ہائے! کہن سخن کی بات، ہائے وہ بات ہی گئی

شوق کی ایک عمر میں، کیسے بدل سکے گا دل
نبض جنوں ہی تو تھی، شہر میں ڈوبتی گئی

اس کی گلی سے اٹھ کے میں، آن پڑا تھا اپنے گھر
ایک گلی کی بات تھی، اور گلی گلی گئی

اس کی امیدِ ناز کا ہم سے یہ مان تھا کہ آپ
عمر گزار دیجیے، عمر گزار دی گئی

دور بہ دور، دل بہ دل، درد بہ درد، دم بہ دم
تیرے یہاں رعایتِ حال نہیں رکھی گئی

جونؔ! جنوبِ زرد کے خاک بسر، یہ دکھ اٹھا
موجِ شمالِ سبز جاں، آئی تھی اور چلی گئی

کیا وہ گماں نہیں رہا؟ ہاں وہ گماں نہیں رہا
کیا وہ امید بجھ گئی؟ ہاں وہ امید بجھ گئی

○

بات کوئی امید کی، مجھ سے نہیں کہی گئی
سو مرے خواب بھی گئے، سو مری نیند بھی گئی

دل کا تھا ایک مدعا، جس نے تباہ کر دیا
دل میں تھی ایک ہی تو بات، وہ جو فقط سنی گئی

جانے کیا تلاش تھی، جونؔ! مرے وجود میں
جس کو میں ڈھونڈتا گیا، جو مجھے ڈھونڈتی گئی

ایک خوشی کا حال ہے، خوش نفساں کے درمیاں
عزتِ شائقینِ غم، تھی جو رہی سہی گئی

خود و وجود کی تمیز، ایک عذاب تھی کہ تھی
یعنی تمام زندگی، ذہن میں ڈوبتی گئی

اس کے جمال کا تھا دن، میرا وجود اور پھر
صبح سے دھوپ بھی گئی، رات سے چاندنی گئی

جب میں تھا شہرِ ذات کا، تھا مرا ہر نفس عذاب
پھر میں وہاں کا تھا جہاں، حالتِ ذات بھی گئی

گرد فشاں ہوں دشت میں، سینہ زناں ہوں شہر میں
تھی جو صبائے سمتِ دل، جانے کہاں چلی گئی

تم نے بہت شراب پی، اس کا سبھی کو دکھ ہے جونؔ
اور جو دکھ ہے وہ یہ ہے، تم کو شراب پی گئی

O

جان! ترے فراق میں، شام سے شب ہوئی گئی
خوب شراب پی گئی، اور خراب پی گئی

شکوہ جو ہے تو اس کا ہے، شکوہ نہیں کیا گیا
رنج جو ہے تو اس کا ہے، بات غلط کی گئی

ہاں وہ پرِ نشاط کیا، ہم سے تو اس قفس کے بیچ
ہاں وہ پرِ خیال کی، وہ بھی چھین لی گئی

پہلو سے اٹھیں کہاں، خواب زمردیں کہاں
یاد پہ وہ رنگ بھی، دل سے نکال دی گئی

سود و زیاں تو خیر کیا، ان کی تمیز ہے عجب
ویسے اسی تمیز میں اپنی تو زندگی گئی

جس کا سرود روشنی، محفلِ شب فروز تھا
اس دلِ داغ دار سے، اپنی ہی روشنی گئی

بوسۂ لباں ترا، ہم کو نصیب کب ہوا
نقلِ تمام زہر کی، نذرِ دہن کو دی گئی

ناف پیالہ اس کا تھا، جونؔ ترے لیے تو منع!
ایسے میں جامِ جم سے کیوں، اے مرے یار پی گئی

○

مجھ میں پڑا ہوا ہوں' حرکت نہیں ہے مجھ میں
حالت نہ پوچھیو تو' حالت نہیں ہے مجھ میں

اب تو نظر میں آ جا' باہوں کے گھر میں آ جا
اے جان! تیری کوئی صورت نہیں ہے مجھ میں

اے رنگ! رنگ میں آ' آغوش تنگ میں آ
باتیں ہی رنگ کی ہیں' رنگت نہیں ہے مجھ میں

اپنے میں ہی کسی کی' ہو روبروئی مجھ کو
ہوں خود سے روبرو میں' ہمت نہیں ہے مجھ میں

اب تو سمٹ کے آ جا اور روح میں سما جا
ویسے کسی کی یارا، وسعت نہیں ہے مجھ میں

شیشے کے اس طرف سے میں سب کو تک رہا ہوں
مرنے کی بھی کسی کو فرصت نہیں ہے مجھ میں

تم مجھ کو اپنے رم میں لے جاؤ ساتھ اپنے
اپنے سے اے غزالو! وحشت نہیں ہے مجھ میں

○

اے غم! خیالِ خوں شدگاں غم، خوش آمدید
دل کے ہلالِ ماہِ محرم، خوش آمدید

شاید وہ یاد مجلسیں تجھ دم سے تازہ ہوں
اے موجِ یاد و درہم و برہم! خوش آمدید

ہے یاں کے اہلِ عشق کی بیدردی فریب
یادِ فراق صاحبِ ماتم، خوش آمدید

یہ تو ہے، اے مشامِ نواز گماں نسیم!
نامحرموں میں دور کی محرم، خوش آمدید

چاہا تھا آپ ہی سے ہمیں، اے خیالِ یار!
اس پاشکستگی میں کرم از کرم، خوش آمدید

خونابہ جگر کی سی پلکوں پہ ہے مہک
اے رنگِ بخشِ دیدۂ پُرنم! خوش آمدید

اے وہمِ موجِ نکہتِ گیسوئے زارِ دوست!
اس دم، کہ تا دم، ترا دم، خوش آمدید

○

کوئی دم بھی میں کب اندر رہا ہوں
لیے ہیں سانس اور باہر رہا ہوں

دھوئیں میں سانس ہیں سانسوں میں پل ہیں
میں روشندان تک ' بس مر رہا ہوں

فنا ہر دم مجھے گنتی رہی ہے
میں اک دم کا تھا اور دن بھر رہا ہوں

ذرا اک سانس روکا تو لگا یوں
کہ اتنی دیر ' اپنے گھر رہا ہوں

گر اپنے منبر سے مجھے کیا
سو خود سے اپنی سمتیں بھر رہا ہوں

ہمیشہ زخم پہنچے ہیں مجھی کو
ہمیشہ میں پسِ لشکر رہا ہوں

بھلا دے نیند کے بستر پہ اے رات!
میں دن بھر اپنی پلکوں پر رہا ہوں

○

ہم نے بھیجا تو اُسے کیا بھیجا
عرضِ ترکِ مدعا بھیجا

کس کا آشوب رمز ہے جس نے
خامشی کو صدا صدا بھیجا

یہ بھی ہے عرضِ شوق کا اک رنگ
ہم نے نامہ، رقیب کا بھیجا

دل نے بھیجی تجھے، متاعِ وفا
دیکھ تو، وہ بھی، جو نہ تھا، بھیجا

اس نے منزل کو بے نشاں رکھ کر
میرے قدموں کو راستہ، بھیجا

سفرِ لذتِ طلب کے لیے
میں نے بلقیس کو سبا بھیجا

ہم جو خود بھی کہیں نہیں موجود
ہم نے اپنی طرف خدا بھیجا

ہائے! رشتوں کی یہ نگہداری
اس کی قربت نے فاصلہ بھیجا

ہم تو بکھرے پہ تا مشامِ خیال
اس کی خوشبو کو بے صبا بھیجا

اپنی خلوت میں خودگری کے لیے
میں نے خود کو جدا جدا بھیجا

جونؔ! لوح و قلم کے مالک نے
دوسروں کا لکھا ہوا بھیجا

کیا خطا تھی ہمیروں کی بھلا
کیوں غریبوں کو بے خطا بھیجا

○

کیا کہوں کیا ہے مرے کشکول میں
ترک دنیا ہے، مرے کشکول میں

قیس اور لیلیٰ ہیں محمل میں سوار
اور صحرا ہے، مرے کشکول میں

جونؔ اب میں کچھ نہیں ہوں لا ہوا
اب فقط لا ہے، مرے کشکول میں

وہ جو ہے ہاں اور نہیں کے درمیاں
بس وہی "یا" ہے مرے کشکول میں

اے مغاں! بھر دو اسے یعنی کہ اک
ناف پیالہ ہے، مرے کشکول میں

عشق جنت کی دھوپ ہے میرا نصیب
اور سایہ ہے، مرے کشکول میں

بول اے یوسف! جو تو ہو قبول
اک زلیخا ہے، مرے کشکول میں

اب صدا کوئی مرے لب پر نہیں
پر وہ لب وا ہے، مرے کشکول میں

ساری دنیا کا گدا پیشہ ہوں میں
ساری دنیا ہے، مرے کشکول میں

ہوں میں اک سائل مگر میرے لیے
ایک پڑیا ہے، مرے کشکول میں

○

حال اک نقشِ حال ہے شاید
یعنی خواب اک خیال ہے شاید

وہ جو ممکن ہے اسے اُمید اُمید
اک محال محال ہے شاید

یہ نمود اور نمو کی روداد
اک ملال ملال ہے شاید

عیش ہاں ، یہ خیال جو ہے
اک نفس کا وہ حال ہے شاید

کیا چلنا، میں اٹھ نہیں سکتا
یہ کوئی میری چال ہے شاید

جونؔ! ہے اک کمال ہو سکنا
اور ہونا، زوال ہے شاید

وہ جو رقص کر رہے دل ہے سو آج
شبِ قتل و قتال ہے شاید

○

نہ کوئی ہجر، نہ کوئی وصال ہے شاید
بس ایک حالتِ بے ماہ و سال ہے شاید

ہوا ہے دیر و حرم میں جو معتکف، وہ یقین
تکانِ سلسلۂ احتمال ہے شاید

خیال و وہم سے برتر ہے اس کی ذات، سو وہ
نہایتِ ہوسِ خد و خال ہے شاید

میں سطحِ حرف پہ تجھ کو اتار لایا ہوں
ترا زوال ہی میرا کمال ہے شاید

میں ایک لمحۂ موجود ہے، ادھر نہ ادھر
سو جو بھی میرے لیے ہے، محال ہے شاید

وہ انہماک ہر اک کام میں کہ ختم نہ ہو
تو کوئی بات ہوئی ہے؟ ملال ہے شاید

گماں ہوا ہے یہ انبوہ سے جوابوں کے
سوال خود ہی، جواب سوال ہے شاید

○

اک ہنر ہے جو کر گیا ہوں میں
سب کے دل سے اتر گیا ہوں میں

کیسے اپنی ہنسی کو ضبط کروں
سن رہا ہوں کہ گھر گیا ہوں میں

کیا بتاؤں کہ مر نہیں پاتا
جیتے جی جب سے مر گیا ہوں میں

اب ہے بس اپنا سامنا درپیش
ہر کسی سے گزر گیا ہوں میں

وہی ناز و ادا، وہی غمزے
سر بہ سر آپ پر گیا ہوں میں

عجب الزام ہوں زمانے کا
کہ یہاں سب کے سر گیا ہوں میں

کبھی خود تک پہنچ نہیں پایا
جب کہ واں، عمر بھر گیا ہوں میں

تم سے جاناں ملا ہوں جس دن سے
بے طرح، خود سے ڈر گیا ہوں میں

کوئے جاناں میں سوگ برپا ہے
کہ اچانک، سدھر گیا ہوں میں

○

دھوپ اٹھاتا ہوں کہ اب سر پہ کوئی بار نہیں
بیچ دیوار ہے اور سایۂ دیوار نہیں

شہر کی گشت میں ہیں صبح سے سارے منصور
اب تو منصور وہی ہے جو سرِ دار نہیں

مت سنو مجھ سے جو آزار اٹھانے ہوں گے
اب کے آزار یہ پھیلا ہے کہ آزار نہیں

سوچتا ہوں کہ بھلا عمر کا حاصل کیا تھا
عمر بھر سانس لیے اور کوئی ابار نہیں

جن دکانوں نے لگائے تھے نگہ میں بازار
اُن دکانوں کا یہ رونا ہے کہ بازار نہیں

اب وہ حالت ہے کہ تھک کر میں خدا ہو جاؤں
کوئی دلدار نہیں، کوئی دل آزار نہیں

مجھ سے تم کام نہ لو، کام میں لاؤ مجھ کو
کوئی تو شہر میں ایسا ہے کہ بیکار نہیں

یاد آشوب کا عالم تو وہ عالم ہے کہ اب
یاد مستوں کو تری یاد بھی درکار نہیں

وقت کو سود پہ دے اور نہ رکھ کوئی حساب
اب بھلا کیسا زیاں؟ کوئی خریدار نہیں

○

اے خرابی طلبِ خانۂ دل اُٹھ تو سہی
میں تو برباد بھی کر دوں کوئی گھر ہو تو سہی

اے عدو! تجھ سے رکھی تیغ بھلا میں نے عزیز
ابھی کر دوں میں تیری نذر، سپر ہو تو سہی

تیرے اصرار پہ اے یار! اب آتا ہے خیال
جو چھپانے کی خبر ہے، وہ خبر ہو تو سہی

کیوں وہ تدبیر نہ بتائے ہمیں حالِ فردا
آسمانوں میں کوئی پیش نگر ہو تو سہی

یوں تو واعظ کا کتب خانہ بہت ہے لیکن
علم میں جہل کا یاروں کے ضرر ہو تو سہی

○

یادوں کا حساب رکھ رہا ہوں
سینے میں عذاب رکھ رہا ہوں

تم کچھ کہے جاؤ ، کیا کہوں میں
بس دل میں جواب رکھ رہا ہوں

دامن میں کیے ہیں جمع گرداب
جیبوں میں حباب رکھ رہا ہوں

آئے گا وہ نخوتی سو میں بھی
کمرے کو خراب رکھ رہا ہوں

تم پر میں ، صحیفہ ہائے کہنہ
اک تازہ کتاب رکھ رہا ہوں

○

مر مٹا ہوں خیال پر اپنے
وجد آتا ہے حال پر اپنے

ابھی مت دیجیو جواب کہ میں
جھوم تو لوں سوال پر اپنے

عمر بھر اپنی آرزو کی ہے
مر نہ جاؤں وصال پر اپنے

اک عطا ہے مری ہوس نگہی
ناز کر خد و خال پر اپنے

اپنا شوق ایک حیلہ ساز، سو اب
شک ہے اس کو جمال پر اپنے

جانے اس دم وہ کس کا ممکن ہو
بحث مت کر، محال پر اپنے

تو بھی آخر کمال کو پہنچا
مست ہوں میں، زوال پر اپنے

خود پہ نادم ہوں جونؔ! یعنی میں
ان دنوں ہوں، کمال پر اپنے

بس یونہی میرا گال رہنے دے
میری جاں! آج گال پر اپنے

کوئی حالت تو اختیار میں ہے
خوش ہوا ہوں، ملال پر اپنے

○

ہم جو بے حالِ زار بیٹھے ہیں
دل کی دلّی بھی ہار بیٹھے ہیں

ایک دلّی ہے سچ سے خالی
سرِ کوچہ، کہار بیٹھے ہیں

ہم سے مت سمجھو وجود کی بات
ہم عدم کو گزار بیٹھے ہیں

ہے وہ بدمحفلی کہ مت پوچھو
یار آئے ہیں، یار بیٹھے ہیں

جان جاناں زندگی! تم کیا
ہم تو خود کو سہار بیٹھے ہیں

دل سے وہ بار بار اٹھتا ہے
اور ہم ' بار بار بیٹھے ہیں

نذرِ میر تقی میر

عشق میں جی کو صبر و تاب کہاں
اس سے آنکھیں لگیں تو خواب کہاں

○

نشۂ جاں کی وہ شراب کہاں
اب وہ دورِ خیال و خواب کہاں

ہم کو بھی کچھ سراغ دے اے دل!
تو ہوا تھا کہاں خراب کہاں

حرفِ سوز اس سے لب ہوئے محروم
دلِ معنی کا اضطراب کہاں

رسدِ رنگ دل کی بند ہوئی
سرِ مژگاں وہ خونِ ناب کہاں

شہر کو ہے سبا کے ہیں ویراں
گئی جگہیں خوش رکاب کہاں

دل نازک کا چاہیے ہے پتہ
بوجھ ڈھوتے ہیں آفتاب کہاں

ہوں رواں سوئے آخرِ دنیا
دم گزاری کی مجھ میں تاب کہاں

نسے اس آستاں کے تھے ہم تو
ہم کو ہونا تھا باریاب کہاں

شور و فریاد اب اس گلی میں نہیں
گئے وہ خانماں خراب کہاں

کیا ہوئے دن وہ دشت گردی کے
تشنگی ہے کہاں، سراب کہاں

ہو گئے ہیں اک اور شخص کے ہم
مگر اس شخص کا جواب کہاں

○

قابلِ رحم ہیں وہ دیوانے
جن کو حاصل نہیں ہیں ویرانے

ہم ہلاکِ ستم نہیں اے دوست!
ہم کو مارا ہے لطفِ بیجا نے

جن کا عنوان بن گئی وہ نظر
کتنے رنگین ہیں وہ افسانے

میں تو اس زندگی سے روٹھا ہوں
آپ کیوں آ رہے ہیں سمجھانے

میری محرومیوں کا غم ہے انھیں
چھلک اٹھیں کہیں نہ پیمانے

کشتۂ اعتماد ہیں ہم لوگ
ہم کو دھوکا دیا ہے دنیا نے

آج ہم مخلصوں کی محفل میں
جونؔ! کس بات کا برا مانے

○

فضائے رنگ میں، رنگینیِ جاں سے لڑائی ہے
بہار آئی ہے اور جانِ بہاراں سے لڑائی ہے

یہی شاید وہ منزل ہے جہاں دل خون ہو جائے
کہ اشک اُلٹے ہوئے ہیں اور داماں سے لڑائی ہے

مشامِ شوق پر جو کچھ گزرتی ہے وہ مت پوچھو
کہ اب تک نکہتِ زلفِ پریشاں سے لڑائی ہے

وہ گیسو مجھ سے برہم ہیں، وہ عارض مجھ سے ناخوش ہیں
کس سے، یا کس سے، شبستاں سے لڑائی ہے

گلوں کی طرح میں بھی ہنسی کیونکر ہنسوں آخر
بہت دن ہو گئے، لب ہائے خنداں سے لڑائی ہے

نہ آئیں گے ادھر جلوے نہ جائیں گی ادھر نظریں
ہمارے شہر سے اور مصر و کنعاں سے لڑائی ہے

نہ ہو کھٹکیں شعور زندگی تو اور پھر کیا ہو
کہ شام عشرت و صبح غزلخواں سے لڑائی ہے

○

سیر و سفر کریں ذرا' سلسلے کہاں چلے
ہم تو چلے' کہاں چلے' بات یہ ہے کہاں چلے

ہم ہیں یہاں سے جا رہے' جانے کہاں ہیں جا رہے
خیر جہاں ہیں جا رہے' بس یہ کہ وہاں چلے

ان مہ و سال درمیاں' عہد ہوئے تھے کچھ یہاں
گر یہ کہاں یہاں سے آج' ہم سوئے شہرِ جاں چلے

ہے وہ بلا چلی کہ ہے' تھم نہ سکے جو تھم رہے
دائرہ ہائے کہکشاں' وہ بھی کہکشاں چلے

کچھ بھی نہیں سفر ہوا' کچھ بھی نہیں گزر ہوا
تو نہیں چل رہا' نہ چل' تیری مگر کہاں چلے

حالتِ حال رفتگی، کچھ نہیں جز گزشتگی
ناگزراں نفس نفس، ہو کے گزشتگاں چلے

پاس ہو عرضِ صحن کا، خاک عمارتوں کو اب
لے کے فراز ہائے بام، سوئے فلک مکاں چلے

کوئی جبیں نہ کر سکی، پاسِ نیازِ آستاں
ہو کے جبیں سے وداع، ناز کے آستاں چلے

مرے گلوں کو سن کے تم آئے تھے اب میں نہیں گلہ کناں
اتنا بڑا ہوں میں کہ آج، تم بھی گلہ کناں چلے

اور کہیں بسائیں گے شہرِ جبیں و آستاں
جو بھی جبیں ہو اٹھ رہے، جو بھی ہو آستاں چلے

زخم زیاں کے بھر بھی جائیں جب بھی انھیں کھرچ کے میں
تازہ کروں اگر مرے، رنگ کی یہ دکاں چلے

مژدہ نہیں کہ ہم سے ہے، آج وہ امتحاں طلب
دل شکنی کو ہم سوئے منزلِ امتحاں چلے

○

میں بے حساب سود و زیاں، کیا کروں بھلا
کوئی یقیں ہے نہ گماں، کیا کروں بھلا

منزل جو اپنے دل کی تھی خود دل میں ہی کہیں
دل بھی پہنچ سکا نہ وہاں، کیا کروں بھلا

صورت وصال کی ہے نہ حالت فراق کی
ہو جیسے آگ اور دھواں، کیا کروں بھلا

میری دکانِ ذات پہ بیٹھا ہے جانے کون
اور میں کھڑا ہوں پیشِ دکاں، کیا کروں بھلا

زخموں کا میرے اور ہی اک رنگ ہے بھلے
زخموں میں بھی ملی نہ اماں، کیا کروں بھلا

○

مرے مستِ ادا! ہر اک سے مت مل
زمانہ ہے بُرا' ہر اک سے مت مل

مجھی سے مل کہ میں بندہ ہوں تیرا
ہے تُو میرا خدا' ہر اک سے مت مل

نگارا' دلبرا! کم کم نظر آ
نگارا' دلبرا! ہر اک سے مت مل

نہ جانے کون کس اطوار کا ہو
ہے میرا مشورہ' ہر اک سے مت مل

مری جاں' اے مری جاں! تُو مجھے بھی
ہر اک سے مت ملا' ہر اک سے مت مل

نہیں دل اب آئینہ کو میرا
میں تجھ سے کہہ چکا، ہر اک سے مت مل

کچھ ایسے بھی ہیں جن سے تو ملا کر
مرا کہنا ہے کیا، ہر اک سے مت مل

نہ کر مجھ سے وفا، شکوہ نہیں ہے
مگر اے بے وفا! ہر اک سے مت مل

یہی تو دلربائی کا ہے نکتہ
ہر اک کے دلربا، ہر اک سے مت مل

خیال آرا رہو تو شہر دل میں
نگاہوں میں نہ آ، ہر اک سے مت مل

ہے مست رنگ تو خود یک جہاں رنگ
سو مستی مت دکھا، ہر اک سے مت مل

عجب ناقدر ہے وہ شخص اپنا
مجھے کہنا پڑا، ہر اک سے مت مل

○

ہر اختیار حالتِ گزر میں ہے
فرصت کسے نصیب کہ فرصت گزر میں ہے

کیا طور اب گلے کا کریں اختیار ہم
اک طورِ بے طرح ہے کہ فرقت گزر میں ہے

کیا تم وہی ہو جو تھے مری جان میری جان!
دکھ یہ ہے بدگمان کی ساعت گزر میں ہے

کیا جبر و اختیار میاں جی! سو چپ رہو
خفا مرا یہ ہے کہ مشیت گزر میں ہے

○

کوئی حالت بھی اب طاری نہیں ہے
تو کیا یہ دل کی ناداری نہیں ہے

میں ہوں ایسے سفر پر جانے والا
کہ جس کی کوئی تیاری نہیں ہے

ہوں زد پہ اس طرح تیرِ قضا کی
ابھی جیسے مری باری نہیں ہے

کہوں کیا، کتنا بے آرام ہوں میں
مری امید ابھی ہاری نہیں ہے

میں اپنے آپ سے ہوں غیر کتنا
کسی سے بھی مری یاری نہیں ہے

ہوں بے حد تنگ اپنے آپ سے میں
کہ اب تک خود سے بیزاری نہیں ہے

یہ میری زندگی، میری اذیت
ہے ایسا وار، جو کاری نہیں ہے

علم اٹھتے تو ہیں اب بھی ہمارے
مگر وہ گریہ و زاری نہیں ہے

بگڑ کر اب بچھڑنے میں ہمارے
مری جاں! کوئی دشواری نہیں ہے

○

عہدِ رفتہ کی متاعِ کارواں گم ہو گئی
آہ! وہ یوسفِ کنعانِ جاں گم ہو گئی

عالمِ غربت میں غارت ہو گئی جنسِ ہنر
قحط سالی میں دنانز کی دکاں گم ہو گئی

عید کے دن میں نے سوچا تھا نکل جائے گا دل
عید کے دن میری دولت بے کراں گم ہو گئی

آہ! وہ عذرائے فن کا عنوانِ دلبری
ہائے! آغازِ جنوں کی داستاں گم ہو گئی

مجھ سے کچھ بھی تو نہیں آتا ہے اس فن کے سوا
اے مری مضراب! تو آخر کہاں گم ہو گئی

بول اے بد بخت! وہ ساماں کہاں غارت کیا
سوچ دیوانے! کہ وہ دولت کہاں گم ہو گئی

چند اوراقِ پریشاں تھے مری کل کائنات
کائناتِ خانۂ بے خانماں گم ہو گئی

○

پرتوِ جاں، بہت ہی کم ٹھیرا
ہم میں جاناں، بہت ہی کم ٹھیرا

ہم تو آئے تھے حشرِ عرصۂ طلب
پہ بیاباں، بہت ہی کم ٹھیرا

ہم تھے یزداں طلب ہمیشہ کے
اور یزداں، بہت ہی کم ٹھیرا

تھا عجب بے حساب دستِ جنوں
سو گریباں، بہت ہی کم ٹھیرا

تھا ہمارا خیال اور کہیں
عہد و پیماں، بہت ہی کم ٹھہرا

ہم تھے خوابیدہ گردِ حالتِ دل
شہرِ خوباں، بہت ہی کم ٹھہرا

تھی یہ کہنہ سرائے دل ہی خراب
جو بھی تھا یاں، بہت ہی کم ٹھہرا

تھی ہوس حاذق ہمہ مطلب
اور ساماں، بہت ہی کم ٹھہرا

○

محفل رسمیں برتی جائیں ' تے آخر کیا بیٹھے
نکلے نہ ہم بیگانہ ادائی ' باہم بیگانہ بیٹھے

ایک قفس گزران میں آخر کیا فرق یار و اغیار
بس کی نشست اور کیا حلقہ' جو بھی جہاں بیٹھا بیٹھے

حالت کی بے ترتیبی نے دل کو کہیں کا بھی نہ رکھا
دل میں ہنستا' لب پہ روتا' الجھے اور الجھا بیٹھے

آگے گلے لگ جاتا گر وہ ہوتا حالت فہم' کہ ہم
اس سے لڑ کر اپنا رشتہ اور کہیں ٹھہرا بیٹھے

وحشت میں خاک اڑانے ہی سے لیلیٰ آن پہنچی تھی
اب مجنوں شہر میں کی ہے، دیکھیں کیا غوغا بیٹھے

اب ہم بچھڑے ہیں سائے سے ورنہ اب تک ایسا تھا
سر سے کسی کا سایہ اٹھا تو، برگد نیچے جا بیٹھے

بار حوادث حلقۂ زناں ہے، میں ہوں غبار دشت گماں
بیٹھا ہوں تو حیرانی کر، ایک بگولا کیا بیٹھے

ایک خلش ایسی ہے دل میں، جس کا درماں کوئی نہیں
کوئی خلش اب دل میں نہیں ہے، سب کچھ ہم گنوا بیٹھے

یار ہماری رسوائی کے داد طلب ہوں اب ہم تو
شہروں، شہروں رسوا ہو کر، اک گوشے میں آ بیٹھے

شہر کے جنگل والے گم ہیں وقت کی دیواروں پر
جنگل کے پھول اور پیڑوں کو تابوں میں لگوا بیٹھے

○

کہتے ہیں جس کو ذات وہ گویا کہیں نہیں
دنیا میں دیکھ آئے، یہ در وہ کہیں نہیں

صحرا پہ میں نے آج یہ نکتہ رقم کیا
دریا کا علم جز ہے دریا کہیں نہیں

پائے سفر شکستہ ہوئے، مدتیں ہوئیں
میں راستے میں ہوں ابھی، پہنچا کہیں نہیں

دے حال ہم کو مفت، ہم اصحابِ کہف ہیں
سکے ہمارے دور کا چلتا کہیں نہیں

○

نکہتِ نرگسِ صنم، دور بہ دور، دم بہ دم
مینا بہ مینا، مے بہ مے، جام بہ جام، خم بہ خم

حالت ہے عاقلگی، قافلہ ہے سو چاہیے
ایک غزل، غزل غزال اور غزال رم بہ رم

زندہ کرو دیار کو، حالتِ خوار خوار کو
شور بہ شور، شب بہ شب، نالہ بہ نالہ، غم بہ غم

ایک وصال ہے کہ ہے، ایک فراق ہے کہ ہے
حال بہ حال، ہم بہ ہم، کیف بہ کیف، کم بہ کم

میں تو ہوں زندہ آج بھی اب سے سر سے پاکو کرو
حیلہ بہ حیلہ، زد بہ زد، زخم بہ زخم، نم بہ نم

ایک خراب کاری تیشہ بہ تیشہ چاہیے
کوچہ بہ کوچہ، زد بہ زد، خانہ بہ خانہ، غم بہ غم

یار ہماری داستاں، نوحہ ہے اور نوحہ خواں
ہائے بہ ہائے، ہُو بہ ہُو، حیف بہ حیف، ہم بہ ہم

ورثہ عجیب شے کا، جونؔ! تمہیں دیا گیا
آہ بہ آہ، اف بہ اف، مژدہ بہ مژدہ، غم بہ غم

شانہ بہ شانہ رشتہ ہے اور ترے مو بہ مو سے ہے
حلقہ بہ حلقہ، سر بہ سر، تار بہ تار، خم بہ خم

ذات کا نشہ ہے عجب، جس کی ہے تلخی منتخب
دور بہ دور، دل بہ دل، درد بہ درد، دم بہ دم

○

حشر دل شہر میں بپا تو ہو
کوئی گھر سے نکل سکا تو ہو

لذت ترک مدعا ہو نصیب
پر میاں کوئی مدعا تو ہو

بکھروں کو تو راس آئے گی
کوئی بکھیں ہے سبا تو ہو

خود کو حال اپنا میں سناؤں جناب
پر کبھی اپنا سامنا تو ہو

ہم تو گھر میں بھی خاک اڑا لیں گے
کوئی گھر سے گیا ہوا تو ہو

غور، بس یہ کچھ نہیں شاید
کوئی یہ گزر رہا تو ہو

اک خموشی میں ہے سخن برپا
کچھ کہا تو ہو، کچھ سنا تو ہو

○

کام مجھ سے کوئی ہوا ہی نہیں
بات یہ ہے کہ میں تو تھا ہی نہیں

مجھ سے بچھڑی جو موجِ نکہتِ یار
پھر میں اس شہر میں رہا ہی نہیں

کس طرح ترکِ مدعا کیجے
جب کوئی اپنا مدعا ہی نہیں

کون ہوں میں جو رائگاں ہی گیا
کون تھا جو کبھی ملا ہی نہیں

ہوں عجب عیشِ غم کی حالت میں
اب کسی سے کوئی گلہ ہی نہیں

بات ہے راستے پہ جانے کی
اور جانے کا راستہ ہی نہیں

ہے خدا ہی پہ منحصر ہر بات
اور آفت یہ ہے، خدا ہی نہیں

دل کی دنیا کچھ اور ہی ہوتی
کیا کہیں اپنا بس چلا ہی نہیں

اب تو مشکل ہے زندگی دل کی
یعنی اب کوئی ماجرا ہی نہیں

ہر طرف ایک حشر برپا ہے
جونؔ! خود سے نکل کے جا ہی نہیں

سوچ آئی تھی ٹھیرنے کی جہاں
اب وہاں خیمۂ صبا ہی نہیں

○

تھا جب تک معیاد کے اندر عہدِ وصال شامِ فراق
کتنی خیال انگیز آتی تھی بار ملال شامِ فراق

اک بے شکوہ محرومی ہے اور تمہارے شکر گزار
شاید شامِ وصل تھی اپنی شامِ زوال شامِ فراق

اتنی بے عہدی و بیگانی اور ویرانی رشتوں کی
کوئی بھی ممکن بات نہیں ہے ممکن خیال شامِ فراق

دل کے کھوں یاد دلاؤ مجھ کو کوئی شامِ وصال
جس کے نام لکھوں اور بھیجوں اپنا حال شامِ فراق

ہم سب کے طرفدار ہیں پر دل کے نہیں ہیں
محفل میں ہیں اور رونقِ محفل کے نہیں ہیں

دل خون کیا ہم نے سرِ کوچۂ قاتل
بسمل ہیں مگر خنجرِ قاتل کے نہیں ہیں

بے نام و نشاں زخم ہیں، سینے میں ہمارے
کچھ وار ہوئے ہیں جو مقابل کے نہیں ہیں

اس رنگ کے طوفاں نے نگاہوں کو ہماری
دکھلائے ہیں جو خواب، وہ ساحل کے نہیں ہیں

یہ وقت کے صحرا میں بھٹکتے ہوئے راہی
منزل پہ چلے آئے ہیں، منزل کے نہیں ہیں

○

نظر حیران ' دل ویران ' مرا جی نہیں لگتا
بچھڑ کے تم سے میری جان! مرا جی نہیں لگتا

کوئی بھی تو نہیں ہے جو پکارے راہ میں مجھ کو
ہوں میں بے نام اک انسان ' مرا جی نہیں لگتا

ہے اک انبوہ قدموں کا رواں ان شاہراہوں پر
نہیں میری کوئی پہچان ' مرا جی نہیں لگتا

جہاں ملتے تھے ہم تم اور جہاں مل کر بچھڑتے تھے
نہ وہ در ہے ' نہ وہ دالان ' مرا جی نہیں لگتا

ہوں پہچانے ہوئے چہرے تو جی کو آس رہتی ہے
ہوں چہرے شہر کے انجان ' مرا جی نہیں لگتا

یہ سارا شہر اک دشتِ تمامِ بے نیازی ہے
یہاں کا شور بے ویراں، میرا جی نہیں لگتا

وہ عالم ہے کہ جیسے میں کوئی ہم نام ہوں اپنا
نہ حرماں ہے نہ وہ درماں، میرا جی نہیں لگتا

کہیں سر ہے کہیں سودا، کہیں وحشت کہیں صحرا
کہیں میں ہوں، کہیں ساماں، میرا جی نہیں لگتا

میرے ہی شہر میں، میرے محلے میں، میرے گھر میں
کہا لو تم مجھے مہماں، میرا جی نہیں لگتا

میں تم کو بھول جاؤں، بھولنے کا دکھ نہ بھولوں گا
نہیں ہے کھیل یہ آساں، میرا جی نہیں لگتا

کوئی پیماں پورا ہو نہیں سکتا مگر پھر بھی
کرو تازہ کوئی پیماں، میرا جی نہیں لگتا

کچھ ایسا ہے کہ جیسے میں یہاں ہوں ایک زندانی
ہیں سارے لوگ زنداں باں، میرا جی نہیں لگتا

○

ہو کے جاتا ہے پُر فن، دم لے
ہے یہ سب سے بڑی تھکن، دم لے

صورت آشوب تر ہے شانہ کشی
ہیں وہ گیسو شکن شکن، دم لے

منطق و گمرہی ناہجار ہیں
یعنی فطرت ہے بے سخن، دم لے

آدمی رہ رہا ہے ڈھوروں پہ
کیا میاں جی میاں وطن، دم لے

دم گزاری کا اک بہانہ تھا
یعنی کچھ بھی نہیں ہے فن، دم لے

زر کے بازار کو لگا دے آگ
یعنی تو کوئی شے نہ بن، دم لے

عطش انگیز تر ہیں وہ بوسے
ہوس شہوت میں تو نہ تن، دم لے

آنے والا ہے دور خاموشی
گفتگو ہے گنوار پن، دم لے

○

لائی تھی شامِ دل کی عجب لہر میں ہمیں
اس چشم نے پلائی مگر زہر میں ہمیں

فتنے اٹھے ہیں ہم سے بہت، تیرے شہر میں
آنا نہ چاہیے تھا، تیرے شہر میں ہمیں

نہلا رہا ہے پرتوِ رنگِ بدن ترا
صبحِ بہار کی شفقیں نہر میں ہمیں

اب آ کے بے گلہ ہی ملیں گے ہم اب تجھے
کوئی بھی غم رہا نہ غم دہر میں ہمیں

ہر سانس اس کا شعلۂ خواہش فروز تھا
کیا ہوش تو وہ لگا، قبر میں ہمیں

○

جونؔ! تمہارا وسعتِ جہل ' عجب گماں میں ہے
جو بھی تھا آسماں میں تھا ' جو بھی ہے آسماں میں ہے

جو ہے یقیں میں مبتلا ' اس کا خدا کرے بھلا
بات ختم ہے جو کہے ' وہ تو فضولیاں میں ہے

خیمہ رہِ خیال میں ' آگیا شوق حال میں
جان! میرا زیاں ہے تُو ' تُو بھی تو ہاں زیاں میں ہے

ایک سرودِ آتشیں ' جادۂ برف برف میں
کب سے ہے برف روپ جونؔ اور یہ دل تپاں میں ہے

ایک سوال کرم جون، شہر میں ہے خبر طرح
وہ جو ہے کیا "نہیں" میں ہے، وہ جو ہے کیا وہ "ہاں" میں ہے

وہ جو ہے نگران دل، وہ جو ہے نگران جاں
اس کا ہے دھیان کیوں میاں، وہ تو کسی گماں میں ہے

یاد کی یاد کچھ نہ پوچھ، گلی ہے سرو و سنگ دل
وہ جو کبھی کا تھا کہ تھا، اب وہ خدایاں میں ہے

مشک و چمن کا سلسلہ، کل تھا نجف میں کہہ رہا
جو بھی مرا شہر تھا، شہر پیردگاں میں ہے

بات جو میرے گھر کی تھی، وہ تو تمام تر کی تھی
ذکر نماز ارے! ارے! زیر اذاں، اذاں میں ہے

بات جو ہر پلک کی ہے، وہ کہیں اب تلک کی ہے
میں بھی گزشتگاں میں ہوں، تو بھی گزشتگاں میں ہے

○

کیا کہیں تم سے بود و باش اپنی
کام ہی کیا، وہی تلاش اپنی

کوئی دم ایسی زندگی بھی کریں
اپنا سینہ ہو اور خراش اپنی

اپنے ہی تیشۂ ندامت سے
ذات ہے اب تو، پاش پاش اپنی

ہے لبوں پر نفس زنی کی دکاں
یاوہ گوئی ہے بس معاش اپنی

تیری صورت پہ ہوں نثار پہ اب
اور صورت کوئی تراش اپنی

جسم و جاں کو تو بیچ ہی ڈالا
اب مجھے بیچنی ہے لاش اپنی

○

میرے مطلوب و مدعا! تو جا
مجھ سے مطلب نہیں ہے جا، تو جا

اب شہادت ہوس ہے یاروں کو
ہوش معزول ہو رہا، تو جا

تو کسی حال میں بھی ہو اس پل
اگلی پل کا ہے اقتضا، تو جا

ہو گیا ہوں میں تیری ذات میں گم
اب میں تیرا نہیں رہا، تو جا

اب تیری بات تیری حد میں نہیں
شوق بڑھنے لگا تیرا، تو جا

جانے میں کب کا آ چکا خود میں
جانے تو کب کا جا چکا، تو جا

ہے مجھے تیری جستجو کرنا
تو ہے اب آدمی لگا، تو جا

ہے تری ذات کیا خیال انگیز
اب ترا کام کیا رہا، تو جا

○

مجھ میں مجھ دل میں تو ڈھلا، تو کیا
ہو میاں جی ترا بھلا، تو کیا

آپ اپنے سے کر کے اپنا حق
چھل گیا ہے مرا گلا، تو کیا

مجھ کو تیری تلاش کرنا ہے
اے میاں! خود سے میں چلا، تو کیا

اب جگن! دونوں وقت ملتے ہیں
آرزو کا دیا جلا، تو کیا

ہے مرے کو ترے خیال کی دھن
نہیں میں تیرا نکلا ، تو جا

تیرے ہونے کی اور نہ ہونے کی
بات ہوتا ہے برملا ، تو جا

وصل ہر لمحے کی جدائی ہے
خود سے اور تجھ سے میں ملا ، تو جا

جو ہجر کی شو ہو دکھ ، وہ ابھی
میرے دل میں نہیں بھلا ، تو جا

تو جو ہے ، میرا چارہ گر ہے تو
میں ہوں گا اکلا ، تو جا

○

کیا ہو گیا ہے گیسوئے خم دار کو ترے
آزاد کر رہے ہیں گرفتار کو ترے

اب تو ہے مدتوں سے شب و روز روبرو
کتنے ہی دن گزر گئے دیدار کو ترے

کل رات چوب دار سمیت آکے لے گیا
اک غول طرحدار، سر دار کو ترے

اب اتنی کند ہو گئی دھار، اے یقیں تری!
اب روکتا نہیں ہے کوئی، وار کو ترے

اب رشتۂ مریض و مسیحا ہوا ہے خوار
سب پیشہ ور لگے ہیں، بیمار کو ترے

باہر نکل کے آ، در و دیوار ذات سے
لے جائے گی ہوا، در و دیوار کو ترے

اے رنگ! اس میں خود ہے ترا ہی زیاں فقط
خوشبو اڑا کے لے گی، زنگار کو ترے

○

جاذم پہ پڑے ہوئے ہیں جنگل
مہروں میں جڑے ہوئے ہیں جنگل

جنگل کا لکھا ہے خاک اڑنا
بیکار اڑے ہوئے ہیں جنگل

دیوار پہ تھالیاں لگی ہیں
جنگل میں گڑے ہوئے ہیں جنگل

آنے کو ادھر ہے شہر کوئی
لینے کو کھڑے ہوئے ہیں جنگل

لوں سانس میں کس ہوا میں جا کر
اندر سے سڑے ہوئے ہیں جنگل

پانی پہ چڑھا ہوا ہے شیشہ
شیشے میں کھڑے ہوئے ہیں جنگل

○

ہر گماں جس پہ وار ڈالا ہے
اُس نے ہی مجھ کو مار ڈالا ہے

نہ اُتارا کسی نے چہرۂ رنگ
یاں بدن تک اُتار ڈالا ہے

خود تن آساں ہے روشنی کتنی
مجھ پہ کرنوں کا بار ڈالا ہے

دیدہ تو نے تنگ کے دامن میں
یاد رکھنا • غبار ڈالا ہے

میں نے قدموں میں تیرے دامن کو
دامن تار تار ڈالا ہے

بات ایسی ہی تھی کہ اب میں نے
بیچ میں خود کو ہار ڈالا ہے

ہار کر اس سے اس کی گردن میں
میں نے ہی بڑھ کے ہار ڈالا ہے

اب نہ کہنا کہ ہم نے دنیا کو
بیچ میں ہار ہار ڈالا ہے

اپنے آگے بھی آبلہ پا نے
خود ہی اک خارزار ڈالا ہے

میرے دشمنوں نے تیرا موسم رنگ
خون ہو کر گزار ڈالا ہے

یوں بیچ پار خود سے اور آگے
اور بھی دور پار ڈالا ہے

○

وہ پیشہ ور ہیں جو لوگوں کے زخم سیتے ہیں
ہمارے زخم ہمارے بہت چہیتے ہیں

شب فراق کا ہم کو بھی کچھ نہ ہوا
وہ دن وصال کے دن تھے جو ہم پہ بیتے ہیں

کوئی بتاؤ کہ آخر یہ ماجرا کیا ہے؟
وہ جان جاں تھا مگر ہم تو اب بھی جیتے ہیں

نیازمند ہوں میں اپنے قدردانوں کا
جو آکے شام کو میری شراب پیتے ہیں

ہمیں بھی سوختہ کرتے ہیں اور تم کو بھی
ہمارے لفظ شمعیں ہیں میاں، پتنگے ہیں

○

چار سوئے نگاہ میں گرد اڑائی چاہیے
وحشت کی شکل بھی کوئی دید میں آئی چاہیے

صوت و صدا کی موج ہے اس طرف سکوت تک
حالتِ خامشی کو بھی اک شنوائی چاہیے

ایسا نگار دلنشیں، ایسا خیال آفریں
اس کا جواب ہی نہیں، اس سے جدائی چاہیے

جسم کو جاں کیا کرو، جاں کو جہاں کیا کرو
میں تو کہوں کہ لفظ کی، قید اٹھائی چاہیے

ایک تھی بس خدا کی ذات' یار عجیب تھی یہ بات
ایسی ہی کوئی دوسری بات' یار بنائی چاہیے

ہم ہیں جہاں کے فقیر' سب کے دعائے دیدہ ور
شہر جہاں میں ہمیں' سب سے بھلائی چاہیے

شوق خدائی کا بجا' خود میں بھی آؤ اک ذرا
اپنی طرف بھی اک نظر' اے مرے بھائی! چاہیے

شہر ہی شہر ہیں کہ ہیں' کوئی نہیں شہر خیز
آؤ چلو کہ شہر شہر' دھوم مچائی چاہیے

○

محبت ہوتے ہوتے، اک ندامت ہو گئی آخر
ندامت ہوتے ہوتے، اک اذیت ہو گئی آخر

عجب انداز سے طے مرحلے دل کے کیے ہم نے
جو دل کی ناز برداری تھی، نفرت ہو گئی آخر

بھلا معلوم کیا ہوگا اُسے، اُس کی جدائی میں
ہمیں خود اپنے شکووں سے، شکایت ہو گئی آخر

کھنچے ہو گئے جذبے، ہوئے بدنام خواب اپنے
کبھی اُس سے، کبھی اُس سے، محبت ہو گئی آخر

پھر خامشی ہے، شام ہے اور صحنِ ویرانی
وہ شامِ فصلِ سرسبزی، حکایت ہو گئی آخر

جدائی جو کبھی تھی اک عذابِ جاودانِ جاں
بلا یہ ہے وہی دل کی سہولت ہو گئی آخر

نہ جانے محملِ لیلیٰ نے کیا دستور اپنایا
کہ دل کو قیس کے صحرا سے وحشت ہو گئی آخر

نہیں اس کی فریبائی ذرا بھی ذکر کے قابل
کہ برہم خود فریبِ دل کی صحبت ہو گئی آخر

مناؤ جانِ جاں! اب جشن تم اپنی فراغت کا
کہ ہوتے ہوتے حالت دل کی؛ رخصت ہو گئی آخر

ہے کیا شوقِ ہمیشہ اور کیا عشقِ ہمیشہ ہے
کہ تھا اک حال سا پھر ایک حالت ہو گئی آخر

گماں دل سے گئے سو دل گیا اپنے گمانوں سے
دریغا! پھر تو بس فرصت ہی فرصت ہو گئی آخر

وہاں کھیلتی رہتی تھیں دل بستی میں پریزاداں!
پھر اس بستی کو ناگاہاں شریعت ہو گئی آخر

فراقِ وصل کا تھا کیا زمانہ کیا کہوں یعنی
فقط اک آن تھی جو بے نہایت ہو گئی آخر

مکانوں اور دکانوں پہ جب اک سانحہ گزرا
ضرورت کی ہر اک شے بے ضرورت ہو گئی آخر

چلے تھے ہم شمالِ تیرہ سبز خواباں سے
ہماری سمتِ جبرِ زر، قسمت ہو گئی آخر

نہ کوئی حالِ دل تھا اور نہ کوئی حالتِ جاں تھی
ہمیں اس سے، اسے ہم سے، محبت ہو گئی آخر

مذاقی اور روقی ایسے زہری تھے کہ مت پوچھو
غمِ دل کو پہ بے دانش کی رحلت ہو گئی آخر

میاں جب حضرتِ شہرِ عشق میں عطار گھوم آیا
اذاں بعد ان پہ برپا اک قیامت ہو گئی آخر

غبارِ روشنی میں نور نے کاٹی شبِ ہجرت
شبِ ہجرت، دوامِ صبحِ ہجرت ہو گئی آخر

○

شاخِ اُمید جل گئی ہو گی
دل کی حالت سنبھل گئی ہو گی

جونؔ! اس آن تک بخیر ہوں میں
زندگی داؤ چل گئی ہو گی

اک جہنم ہے میرا سینہ بھی
آرزو کب کی جل گئی ہو گی

سوزشِ پرتوِ نگاہ نہ پوچھ
مژہ تو پگھل گئی ہو گی

ہم نے دیکھے تھے خواب شعلوں کے
نیند آنکھوں میں جل گئی ہوگی

اس نے مایوس کر دیا ہوگا
پھانس دل سے نکل گئی ہوگی

اب تو دل ہی بدل گیا اب تو
ساری دنیا بدل گئی ہوگی

دل گلی میں رقیب دل کا جلوس
واں تو تلوار چل گئی ہوگی

گھر سے جس روز میں چلا ہوں گا
دل کی دلّی مچل گئی ہوگی

دھوپ نیمنی کہ زرد زرد اک دھوپ
لال قلعے سے ڈھل گئی ہوگی

ہجر حدت میں یار کی خوشبو
ایک پنکھا سا جھل گئی ہوگی

آئی تھی موجِ سبزۂ بادِ شمال
یاد کی شاخ پھل گئی ہوگی

وہ دمِ صبح، غسل خانے میں
میرے پہلو سے، نکل گئی ہوگی

شام صبحِ فراق دائم ہے
اب طبیعت بہل گئی ہوگی

○

اپنا خاکہ لگتا ہوں
ایک تماشا لگتا ہوں

آئینوں کو زنگ لگا
اب میں کیسا لگتا ہوں

اب میں کوئی شخص نہیں
اُس کا سایہ لگتا ہوں

سارے رشتے تشنہ ہیں
کیا میں دریا لگتا ہوں

اس سے گلے مل کر خود کو
تنہا تنہا لگتا ہوں

خود کو میں سب آنکھوں میں
دھندلا دھندلا لگتا ہوں

میں ہر لمحہ اس گھر سے
جانے والا لگتا ہوں

کیا ہوئے وہ سب لوگ کہ میں
سونا سونا لگتا ہوں

مصلحت اس میں کیا ہے مری
ٹوٹا پھوٹا لگتا ہوں

کیا تم کو اس حال میں بھی
میں دنیا کا لگتا ہوں

کب کا روگی ہوں ویسے
شہر مسیحا لگتا ہوں

میرا پیچھا تو کر دو
گئی گئی پیاسا لگتا ہوں

مجھ سے کہا تو کچھ پیچھے
زندہ مردہ لگتا ہوں

میں نے بیچے ہیں گھر اپنے
اب بے چارہ لگتا ہوں

○

زندگی بے وفائی کی ٹھہری
پھر ہمیشہ جدائی کی ٹھہری

نسبتِ جان و دل ہوئی برباد
پھر فقط آشنائی کی ٹھہری

جان و دل کا تھا ایک رمز جو تھا
آورشِ یک جدائی کی ٹھہری

رہے پہلے وفا سراپا ہم
اور پھر بے وفائی کی ٹھہری

ہم تھے اک دوسرے کے پہلو میں
پھر میاں! نارسائی کی ٹھہری

ہم ہمہ تھے ایک جان تھے دونوں
کہ اچانک لڑائی کی ٹھہری

میں اسے جان کر نہ پہچانا
ہجر میں بھی کمائی کی ٹھہری

ہم حسینوں میں ناقبول ہوئے
سو میاں، پارسائی کی ٹھہری

آخرش اس کو ہم نے کھینچ لیا
بات اس کی کلائی کی ٹھہری

ہوئے برباد آدم و ابلیس
جب ازل میں خدائی کی ٹھہری

آپ بیٹھے نہیں ہیں، بیٹھے تو
اس قدر کیوں برائی کی ٹھہری

وہ حیا تھا' حیا کی جان تھا وہ
اور پھر بے حیائی کی ٹھیری

تھا سروں میں بھلائی کا سودا
جانے پھر کیوں' بُرائی کی ٹھیری

شہر ہم کو ذرا نہیں بھاتے
آخرش' بادیائی کی ٹھیری

ہم کو گھر چاہیے تھا جو نہ ملا
سو میاں' ناکجائی کی ٹھیری

اس کے پیمان تھے کہ حشرِ نظر
پھر تو لب آزمائی کی ٹھیری

کیا ازل' کیا ابد' میاں جی میاں
آن اک انتہائی کی ٹھیری

بیچ گھر اپنے کھنچ گئی دیوار
پھر فقط اک دہائی کی ٹھیری

○

جو گزر دشمن ہے' اس کا رہگزر رکھا ہے نام
ذات سے اپنی نہ ملنے کا سفر رکھا ہے نام

پڑ گیا ہے اک بھنور' اس کو سمجھ بیٹھے ہیں گھر
لہر اٹھی ہے' لہر کا دیوار و در رکھا ہے نام

نام جس کا بھی نکل جائے اسی پر ہے مدار
اس کا ہونا یا نہ ہونا کیا' مگر رکھا ہے نام

ہم یہاں خود آئے ہیں' لایا نہیں کوئی ہمیں
اور خدا کا ہم نے اپنے نام پر رکھا ہے نام

چاک چاک دیکھ کر دامن پہنائی کی
میں نے اپنے پیرہن کا 'بخیہ گر' رکھا ہے نام

میرا سینہ کوئی چھلنی بھی اگر کر دے تو کیا
میں نے تو اب اپنے بیٹے کا 'سپر' رکھا ہے نام

دن ہوئے پر تو کہیں ہوتا کسی بھی شکل میں
جاگ کر خوابوں نے تو رات بھر رکھا ہے نام

○

زندگی سے بہت ہی بدظن ہیں
کاش! اک بار مر گئے ہوتے

مرہم پاس یار ہی نہ رہا
اب تلک زخم بھر گئے ہوتے

اجتہاد جنوں سے کیا پایا
سب جدھر تھے، ادھر گئے ہوتے

غیر کے دل میں گر اترنا تھا
میرے دل سے اتر گئے ہوتے

پاسے گماں فرش واد و گل
نہ دم نشتر گئے ہوئے

وقت پہ رازداں نے دغا دیا
چارہ گر، کام کر گئے ہوئے

میرے وحشت کدہ میں کیوں آئے
تیغ و کماں گئے ہوئے

بار بار اس نے دی تھیں آوازیں
سوچتے میں پڑ گئے ہوئے

نہ ملا ہم کو وقت شادکشی
کتنے گیسو سنور گئے ہوئے

○

ابھی میں ہو چکا، اب کیا نہ چاہوں
سزا ہونے کی ہے، ہونا نہ چاہوں

تو میرے بعد رکھے گا مجھے یاد
میں اپنے بعد اک لمحہ نہ چاہوں

جدھر دیکھو اُدھر بے پردگی ہے
کدھر دیکھوں کہ میں پردہ نہ چاہوں

لبوں پر ہے بپا حرفوں کی محفل
ابھی گفتار میں آیا نہ چاہوں

جہان دیدہ میں نایاب ہو جا
مری جاں! میں تجھے بچھڑا نہ چاہوں

ہیں سب رستے پشیمانی کے رستے
میں چلنا چاہوں، پر رستہ نہ چاہوں

نہ کوئی چاپ زندہ ہے نہ دستک
تو کیا میں گھر میں دروازہ نہ چاہوں

ہے اب تو سامنے تیرا اک ابہام
بھلا اب کیوں ترا آنا نہ چاہوں

خیالیں کہتے ہیں یہ شب کے انداز
کہیں میں کوئی اندازہ نہ چاہوں

وہ بیٹھا ہے دریچے بند کر کے
میں دیواروں کو بے پردہ نہ چاہوں

جو بولے جاؤ تو رشتے سنیں گے
سو کیا چاہوں جو چپ رہنا نہ چاہوں

لگا ہونٹوں سے مرغولہ دھوئیں کا
ٹھہر جا! میں ابھی مرنا نہ چاہوں

سخن کی موت ہے یارو سخن بیچ
میں بستی میں کوئی لب وا نہ چاہوں

جو اگلے پل تلک جینا ہوا تب
بھلا کیسے کوئی وعدہ نہ چاہوں

نہ کیوں ہونٹوں کہ ہے اک شور برپا
بھلا میں، اور سنانا نہ چاہوں

○

یہاں تک اب سخن ہے، کچھ نہ کہیے
بڑا بیگانہ پن ہے، کچھ نہ کہیے

کیا ہے اک چمن دل نے زباں سے
زباں سے یہ چمن ہے، کچھ نہ کہیے

بس اب تک ہے آبادی سخن کی
وہاں سے خود کا بن ہے، کچھ نہ کہیے

نہ کہنا تک یہاں کہنا نہ ٹھیرا
مری اب یہ سخن ہے، کچھ نہ کہیے

بھلا رونا اور اس پہ خون رونا
تن آسانی کا فن ہے، کچھ نہ کہیے

○

ختم ہے دل کے حساب کا جاناں
وہ جو سب کچھ تھا کیا ہوا جاناں

تم ہو آغوش میں مگر پھر بھی
دل نہیں لگ رہا مرا جاناں

میں بھی کچھ بھی نہیں تھا اور تم بھی
یعنی جو کچھ تھا، خواب تھا جاناں

شہرِ تعبیر ہو گیا آباد
خواب برباد ہو گیا جاناں

میں نے کیا کیا کچھ کیا نہیں معلوم
تم ہو جو تم نے کیا سنا جاناں

ہم نے سمجھا تھا جس کو روزِ جہاں
کسی لمحے کا حال تھا جاناں

یوں نہ پوچھو بچھڑ کے تم سے مجھے
کتنے برس اس کا غم رہا جاناں

ہم ہیں محرومِ وسعتِ یک گام
میر کو لکھنؤ ملا جاناں

کیا سنائیں تمہیں حکایتِ دل
ہم کو دھوکا دیا گیا جاناں

ہے خدا سے مناظرہ درپیش
آ گیا کون تیسرا جاناں

ہے وہ غربت کہ اب مرے دل میں
کچھ نہیں ہے مرے سوا جاناں

اسی عالم میں جلتا ہوں میں
وہ جو عالم ہے شہر کا جاناں

کس سے ہم اپنے دل کی بات کریں
شہر دلّی نہیں رہا جاناں

ہم وہاں ہیں ہمارے ساتھ جہاں
میر بھی خون تھوکتا جاناں

کیا غمِ ہجر اور عیشِ وصال
اک تماشا ہوا کیا جاناں

کیا بتاؤں ہے کتنی بے احوال
حالتِ ترکِ مدعا جاناں

اب ہمیں زندگی گزارنی ہے
یعنی وہ کھیل ہو چکا جاناں

کاش! تم سچ کے حال میں ہوتے
اور میں جھوٹ بولتا جاناں

ہم کو گرداب میں ہے اک اُمید
پر کہیں بھی نہیں خدا جاناں

میں بھی اب بے کلہ ہوں اور تم بھی
یعنی کچھ بھی نہیں بچا جاناں

مجھ پہ اور تم پہ جس کا تھا احساں
کل وہ قاصد بھی مر گیا جاناں

نشاطِ شوق کے صد شوق بے کمال کے لوگ
عجب تھے وہ طربِ آرزو ملال کے لوگ

گنوا دیا انھیں تو نے جمال مستی میں
جمال مست چلے تھے تجھے کمال کے لوگ

گنوا کے اب جنھیں غم ہے نظر کی بیداری
وہ ایک خواب کی محفل تھی اور خیال کے لوگ

رہے جواب کی آمادگی سے بے سروکار
عجب ہی لوگ تھے، سرمستیِ سوال کے لوگ

نہ جانے کیا تھی وہ اک نیم کرشمہ بے تھی
کہ جس کے سحر سے مگن ہوئے محال کے لوگ

ترا ہی گر ترے آغوش میں رہا نہ خیال
ترے خیال میں ہوں گے ترے خیال کے لوگ

○

گفتگو جب محال کی ہو گی
بات اس کی مثال کی ہو گی

زندگی ہے خیال کی اک بات
جو کسی بے خیال کی ہو گی

تھی جو خوشبو صبا کی چادر میں
وہ تمہاری ہی شال کی ہو گی

نہ سمجھ پائیں گے وہ اہلِ فراق
جو اذیت وصال کی ہو گی

دل پہ طاری ہے اک کمالِ خوشی
شاید اپنے زوال کی ہو گی

جو عطا ہو وصالِ جاناں کی
وہ اداسی کمال کی ہو گی

آج کہنا ہے دل کو حال اپنا
آج تو سب کے حال کی ہو گی

ہو چکا میں، سو فکر یاروں کو
اب مری دیکھ بھال کی ہو گی

اب خلش کیا فراق کی اس سے
اک خلش ماہ و سال کی ہو گی

کفر و ایماں کہا گیا جس کو
بات وہ خد و خال کی ہو گی

جوشِ دل کے سخن میں آیا ہے
ہر غزل اک غزال کی ہو گی

کب تلک آئے گی جواب کو راس
جو بھی حالت سوال کی ہو گی

○

انقلاب ایک خواب ہے، سو ہے
دل کی دنیا خراب ہے، سو ہے

رہیو تو یونہی محوِ آرائش
باہر اک اضطراب ہے، سو ہے

تر ہے وحشت اس کے عکسِ منظر سے
اور خود وہ سراب ہے، سو ہے

جو بھی وحشتِ طلب کا ہے ہم رو
وہی زریں رکاب ہے، سو ہے

شیخ صاحب لیے چھری تیز
برہمن فتح یاب ہے، سو ہے

دہر آشوب ہے سوالوں کا
اور خدا لاجواب ہے، سو ہے

اس شب تیرہ بخت میں
روشنی ایک خواب ہے، سو ہے

○

دید کی ایک آن میں کارِ دوام ہو گیا
وہ بھی تمام ہو گیا، میں بھی تمام ہو گیا

اب میں ہوں اک عذاب میں اور عجب عذاب میں
جنتِ پُر سکوت میں، مجھ سے کلام ہو گیا

آہ! وہ عیشِ رازِ جاں، ہائے! وہ عیشِ رازِ جاں
ہائے! وہ عیشِ رازِ جاں، شہر میں عام ہو گیا

رشتۂ رنگِ جاں مرا، نکہتِ ناز سے تری
پختہ ہوا اور اس قدر، یعنی کہ خام ہو گیا

پوچھ نہ وصل کا حساب، حال ہے اب بہت خراب
رشتۂ جسم و جاں کے بیچ، جسم حرام ہو گیا

شہر کی داستاں نہ پوچھ، ہے یہ عجیب داستاں
آنے سے شہریار کے شہر غلام ہو گیا

دل کی کہانیاں بنیں، کوچہ بہ کوچہ کو بہ کو
سہہ کے ملال شہر کا، شہر میں نام ہو گیا

جونؔ کی تشنگی کا تھا خوب ہی ماجرا کہ جو
مینا بہ مینا، مے بہ مے، جام بہ جام، ہو گیا

ناف پیالے کو ترے، دیکھ لیا مغاں نے جان
سارے ہی میکدے کا آج، کام تمام ہو گیا

اس کی نگاہ اٹھ گئی اور میں اٹھ کے رہ گیا
میری نگاہ جھک گئی اور سلام ہو گیا

○

عشق کا بار اتار آیا ہوں
آج میں اس کو ہار آیا ہوں

اُف! مرا آج میکدے آنا
یوں تو میں کتنی بار آیا ہوں

دوستو! دوست کو سنبھالا دو
دور سے پا فگار آیا ہوں

صفِ آخر سے لڑ رہا تھا میں
اور یہاں لاش وار آیا ہوں

وہی دشتِ عذابِ مایوسی
وہیں انجامِ کار آیا ہوں

○

ہوں میں احوال فراموش، مرے ساتھ رہو
آج تک بھی ہوں میں بے ہوش مرے ساتھ رہو

میری مستی کو ہے آغوش محبت کی ہوس
اور نایاب ہے آغوش، مرے ساتھ رہو

اے مرے ہم نفسان روش ہم نفسی!
ہو چلی بادہ سرجوش، مرے ساتھ رہو

بس سنے جاؤ، تمہاری ہی کہے جاؤں گا
میرے یارو! ہمہ تن گوش، مرے ساتھ رہو

خواب کی شب کا ہوں میں ہی تو بس خوش گفتار
خواب کے شہر میں خاموش، مرے ساتھ رہو

کیا خبر راہ میں مجھ سے کوئی سر ٹکرا دے
ہوں کے کچھ اور بھی مدہوش، مرے ساتھ رہو

پی کے آیا تھا میں پھر ساتھ تمہارا بھی دیا
میکشو! تم کہ ہو کم نوش، مرے ساتھ رہو

وعدۂ شام کا مطلب ہے سحر کا وعدہ
وہ ہے اک وعدہ فراموش، مرے ساتھ رہو

تم مرے ساتھ رہو مست خیالو! تم کو
فکرِ فردا، نہ غمِ دوش، مرے ساتھ رہو

○

اس گلی کچھ بھی کر نہیں اٹھتے
بیٹھ کر عمر بھر نہیں اٹھتے

تجھ سے جبر اٹھے گا کیسے بھلا
اٹھتے ہیں لوگ، پر نہیں اٹھتے

تو میاں دل کو اندر آ کے دیکھ
یوں کہا ہے پہ گھر نہیں اٹھتے

تجھ محلے کو یہ ہوا کیا ہے
واں سے اب نامور نہیں اٹھتے

شاید اپنا نہیں کوئی ڈیرا
ہم بھی آشفتہ سر نہیں اٹھتے

وقت کا رن بھی اک تماشا ہے
پاؤں اٹھتے ہیں، سر نہیں اٹھتے

حالت احوال کیا بتائیں کہ ہم
اٹھنے لگتے ہیں، پر نہیں اٹھتے

کل لے جائے گا بہا کے تمھیں
تم یہاں سے اگر نہیں اٹھتے

○

وہی دیوار ہے اپنی، وہی در ہے درپیش
کیسے پھیروں میں یہاں، پھر وہی گھر ہے درپیش

رنگ ہاتھوں سے ہر اک کام نمو لو اب تو
خاک منظر نظر آئے کہ نظر ہے درپیش

رخصت اے ہمسفرو! دور ہے منزل میری
ذات سے ذات تلک مجھ کو سفر ہے درپیش

ناف پیالے کی ہوس میں نہ بھلا دوں اس کو
سر پستاں سے جو تا زیر کمر ہے درپیش

درمیاں دو نفس مرحلے ایسے ہیں کہ بس
کوئی مشکل نہیں درپیش ، مگر ہے درپیش

عرض جب دیدۂ بینا نے کیا شوقِ نگہ
عذرِ بینائی یہ تھا ، خونِ جگر ہے درپیش

جاں نثاروں کے میں نرغے میں ہوں اے تیغِ عدو!
سر بھلا کیسے بچاؤں کہ سپر ہے درپیش

قافلہ ہے کہ اب آگے نہیں بڑھنے پاتا
حرف ہموار کوئی راہگزر ہے درپیش

○

میں نہ کسی یقیں میں ہوں اور نہ کسی گماں میں ہوں
محتسبانِ شہر کے قافلۂ زیاں میں ہوں

کون منائے گا یہاں جشنِ جلوسِ خسرواں
تُو بھی شکستگاں میں ہے، میں بھی شکستگاں میں ہوں

کاش! تجھے سنا سکیں، ہم کوئی مژدۂ حیات
ہاں میں بلاکشوں کے ساتھ جادۂ امتحاں میں ہوں

کتنے شیریں ہیں ترے شہر کے لوگ اے نگارا
حشر گلی میں ہے بپا، میں جو تری اماں میں ہوں

تو نے جو مجھ کو داد دی، اس پہ میں خوش نہیں کہ میں
مہمانِ محفلِ عشرتِ دیگراں میں ہوں

○

ہر جا سے واپس آ سکے ہم
پر خود سے کہیں نہ جا سکے ہم

اب یاد ہی اس کی لیجیے آپ
کچھ بھی تو نہیں بچا سکے ہم

اب آپ اسے زہر خند کہہ لیں
اتنا تو ہے، مسکرا سکے ہم

یہ شکوۂ جبر ناروا ہے
سب کچھ تو یہاں گنوا سکے ہم

تھے طاق ہنر میں جو لے گے
پر خود کو نہیں بھلا سکے ہم

تھی انجمنِ خیال برپا
اس سے جو نہ دل لگا سکے ہم

بازی میں نمود و بود کی جونؔ
بس دل ہی نہیں لگا سکے ہم

رونا تو یہی ہے، زندگی میں
دھوکا ہی تو بس نہ کھا سکے ہم

کھونے کا تھا ایک کھیل جس میں
اکثر تو خدا کو پا سکے ہم

جو حاصلِ واقعہ ہے، یہ ہے
بس خود میں نہیں سما سکے ہم

O

شوق کی راہ پر اگر چلیے
چار جانب سے بے خبر چلیے

کوئی تو کارنامہ دیں انجام
اس محلے میں نام کر چلیے

کوئے جاناں کی ناکہ بندی ہے
دلِ ہنگامہ جو ! کدھر چلیے

آرزوئے وصال کا رستہ
ہے وہ رستہ کہ عمر بھر چلیے

اک عجب لہر جی میں آئی ہے
اس کی بانہوں میں جا کے مر جائیے

بے وفائی کا کچھ تو لیں بدلہ
کوئی الزام اس پہ دھر جائیے

○

مسکنِ ماہ و سال چھوڑ گیا
دل کو اُس کا خیال چھوڑ گیا

تازہ دم جسم و جاں تھے فرقت میں
وصل، اُس کا نڈھال چھوڑ گیا

عہدِ ماضی جو تھا عجب پُرحال
ایک ویران حال چھوڑ گیا

ژالہ باری کے مرحلوں کا سفر
قافلے، پائمال چھوڑ گیا

دل کو اب یہ بھی یاد ہو کہ نہ ہو
کون تھا ' کیا ملال چھوڑ گیا

میں بھی اب خود سے ہوں جواب طلب
وہ مجھے ' بے سوال چھوڑ گیا

○

رنج ہے حالتِ سفر، حالِ قیام رنج ہے
صبح بہ صبح رنج ہے، شام بہ شام رنج ہے

اس کی شمیمِ زلف کا کیسے ہو شکریہ ادا
جب کہ شمیم رنج ہے، جب کہ مشام رنج ہے

صید تو کیا کہ صید کار خود بھی نہیں یہ جانتا
دانہ بھی رنج ہے یہاں، یعنی کہ دام رنج ہے

سعیِ جاودانِ جاں کچھ بھی نہیں مگر زیاں
سارے کلیم ہیں زبوں، سارا کلام رنج ہے

ہا ہا الف مری نمود رنج ہے آپ کے بجول
کیا مرا نام بھی ہے رنج، ہاں ترا نام رنج ہے

○

سرِ شام ایسی ہوا چلی تری یاد، یار مہک اٹھی
مری جو بہار خزاں ہوئی، مری وہ بہار مہک اٹھی

کبھی سانس لی جو خیال میں تری جلوہ گاہِ وصال میں
تو ہوائے فرقتِ شہرِ دل، سرِ رہگزار مہک اٹھی

وہ شمیم قول و قرارِ جاں، مجھے آئی یاد جو ناگہاں
تو مرے وجود میں پھر کوئی شبِ انتظار مہک اٹھی

جو کبھی دریچۂ دل کھلا، تو وہی فضا تھی وہی صبا
تو وہی نقشِ رنگ تھا، نظر ایک بار مہک اٹھی

زدۂ مشامِ فراق ہے، اُس شہرِ نکہت و ناز سے
کوئی یاد جو کبھی آ گئی، کوئی یادگار مہک اٹھی

○

اگر چاہو تو آنا کچھ نہیں دشوار، آ نکلو
شروعِ شب کی محفل ہے مری سرکار! آ نکلو

تمھیں معلوم ہے ہم تو زمانے کے نہ چاہے کے
تڑپتا ہے تمھیں ہی دیکھنے کو یار، آ نکلو

بھروسہ ہی نہیں تم کو کسی پر اور یہاں سب ہیں
تمھارے ساتھ آنے کے لیے تیار، آ نکلو

خرابے میں، سرِ شامِ تمنا، اے شہِ خوباں!
کہ خانہ خرابوں کا ہے اک دربار، آ نکلو

جو آنکھیں ہو گئیں محروم راتوں میں بھی خوابوں سے
ہیں دن میں بھی وہ خوابوں ہی کی چابدار، آنکھو

تمہاری نرگسِ بیمار ہی کے آسرے پر ہیں
تمہاری نرگسِ بیمار کے بیمار، آنکھو

ہماری کیا خریداری کہ یکسر تنگ داری ہیں
زلیخا وار کیا آؤ گے، شیریں وار، آنکھو

تمہیں ہم سے ملے گا کیا مگر ہم پھر تمہارے ہیں
ہماری قدر جانو اور یونہی بیکار، آنکھو

اگر پوشیدہ رہنا تجربوں سے ہے تو پھر یارو!
ہماری مصلحت مانو، سر بازار، آنکھو

○

کر رہا ہوں میں عمرِ فن برباد
لوگ کہتے ہیں، کام کرتا ہوں

یہ تو عالم ہے خوش مزاجی کا
گھر میں ہر شخص سے الجھتا ہوں

دشمنو تم کو خوف کس کا ہے
مار ڈالو کہ میں اکیلا ہوں

آپ ملتے نہیں، بجا کہیے
کیا میں یہ بات دل سے کہتا ہوں

سرِ محفل یہ حال ہے میرا
جیسے خود کو بھلا کے لایا ہوں

اُف! یہ غفلت کہ ایک دو پل بھی
اس فکر میں ہے کہ میں کیا ہوں

○

دل نے جاناں کو جو شب نامۂ ہجراں لکھا
اشکِ خونیں کو چراغاں، سرِ مژگاں لکھا

اے جنوں! میں نے تری بے سروسامانی میں
اک عجب دُکھ سے، "اُسے" بے سروساماں لکھا

ہم عجب شعبدہ گر ہیں، بندھے ہاتھوں ہم نے
اس کی بانہوں سے ملاقات کا ارماں لکھا

میں جنوں میں بھی زباں سے کبھی غافل نہ رہا
ہاتھ کو ہاتھ، گریباں کو گریباں لکھا

ہائے وہ حال کہ جب جان سے جاتے ہوئے بھی
اپنے ہی آپ کو جس شخص نے جاناں لکھا

زلف کو اس کی بھلا مجھ سے شکایت کیوں ہے
جو پریشاں تھا اسے میں نے پریشاں لکھا

جب سنا میں نے کہ ہے میرا تو خالق بھی محال
اس کے نام ایک ہوس نامۂ امکاں لکھا

تو پسند آئی نہیں ہم کو مگر اس پہ بھی
زندگی! ہم نے تجھے کیسے بجاں لکھا

ہم نے اے عالمِ خاموشیٔ جاوید تیرا!
خود کو تیری سماعت میں غزل خواں لکھا

○

ہے وہ گروہ اپنا جو راہ پہ نہ آیا
جینے کو جی رہے ہیں، جینا مگر نہ آیا

تم دیکھتے ہو میرا کیا حال ہو گیا ہے
پر میرے دیکھنے کو وہ بے خبر نہ آیا

ویسے میں ہوش میں ہوں پر مجھ کو لگ رہا ہے
تم ہوش میں نہ لاؤ جب چارہ گر نہ آیا

اک شام اور گزری، اک رات اور آئی
وہ سحر تک نہ آیا، وہ سحر پر نہ آیا

یہ ہوش ہے کہ اس کی مستی پہ گفتگو تھی
بعد اس کے ہوش ہم کو پھر رات بھر نہ آیا

اب ہم کسی کو اپنی روداد کیا سنائیں
اک عمر دل میں رہ کر اک دن وہ گھر نہ آیا

وہ رنگ ہے تو آخر ہم کو نظر بھی آئے
وہ رنگ تھا، سو ہوگا، ہم کو نظر نہ آیا

ہر شکوہ ناروا ہے، یارو! یہ ماجرا ہے
ہم جان سے گئے، پر طورِ سفر نہ آیا

دوری کا اب گلہ کیا، دوری کی عمر ساری
پل تھی جسے حسابِ شام و سحر نہ آیا

O

لازم ہے اپنے آپ کی امداد، کچھ کروں
سینے میں وہ خلا ہے کہ ایجاد کچھ کروں

ہر لمحہ اپنے آپ میں پاتا ہوں کچھ کمی
ہر لمحہ اپنے آپ میں، ازداد کچھ کروں

روکار ہے تو اپنی میں لگتا ہوں پائیدار
بنیاد رہ گئی، بے بنیاد کچھ کروں

طاری ہوا ہے مجھ پہ موجود اس طرح
کچھ بھی نہ یاد آئے، اگر یاد کچھ کروں

موسم کا مجھ سے کوئی تقاضا ہے دم بہ دم
بے سلسلہ نفس یاد، کچھ کروں

○

حال یہ ہے اب تم سے بچھڑے ہم کو ماہ و سال ہوئے
ہم تو ہیں کل سے تڑپے، تم بھی کچھ بے حال ہوئے

میں جو شمال سبز گیا تھا، پیلا ہو کر لوٹا ہوں
شہروں نے وہ یورش کی ہے، سب جنگل پامال ہوئے

میری محبت تیری رقیبی، دونوں کا تھا ایک نصیب
اس کی گلی کو چھوڑ کے ہم تم، دونوں بے اقبال ہوئے

میرا اپنا طور عجب تھا ورنہ اس کے کوچے میں
میرے سوا سارے ہی مجرم، کتنے مالامال ہوئے

کتنے جھوٹے بیچ میں آئے، حال کرو اتفاق میں
آئینے پر زنگ وہ آیا، ہم سب بے تمثال ہوئے

سود و زیاں کی بات ہی کیا ہے سود و زیاں کی بات بھی کیا
تم شاخوں کی کونپل ٹھہرے، ہم پیڑوں کی چھال ہوئے

شوق نے جب سے بستی چھوڑی، اپنی پُر احوالی کی
سارے فقرے جھوٹے نکلے، سب عشوے جنجال ہوئے

ہم میدان شکستِ جاں کی کیا روداد کہیں تم سے
تیغ دو دم تھے یار ہمارے، ہم یاروں کی ڈھال ہوئے

مر کے بھی کچھ کم تو نہیں تھا اپنا سوزِ زخمِ جگر
پر تم مجھ سے کچھ مت پوچھو، جو گزرے امسال ہوئے

دلِ برباد کو آباد کیا ہے میں نے
آج مدت میں تمھیں یاد کیا ہے میں نے

ذوقِ پرواز تب و تاب عطا فرما کر
صید کو لائقِ صیاد کیا ہے میں نے

تلخیِ دورِ گزشتہ کا تصور کر کے
دل کو پھر مائلِ فریاد کیا ہے میں نے

آج اس سوزِ تصور کی خوشی میں اے دوست!
طائرِ صبر کو آزاد کیا ہے میں نے

ہو کے اسرارِ غمِ تازہ سے مجبورِ فغاں
چشم کو اشکِ تر امداد کیا ہے میں نے

تم سے کہتے تھے ہنگامہ پسندی میری
پھر وہی طرزِ غم ایجاد کیا ہے میں نے

پھر گوارا ہے مجھے عشق کی ہر اک مشکل
تازہ پھر شیوۂ فریاد کیا ہے میں نے

○

تو سحر و معجزہ بھی دکھا دے مقال کا
ممکن نہیں جواب، کسی بھی سوال کا

آئے یقیں اسی کی ودیعت وہی کے ساتھ
ہم کو گمان تک نہ ہو جس احتمال کا

تو مجھ کو مجھ سے روک رہا ہے، کمال ہے
منظر تو رُک کے دیکھ لوں اپنے زوال کا

اے ہم نفس! ودیعتِ فطرت پہ ناز کیوں
پرواز کیا ہنر ہے ترے شاہپال کا

پرسش کا دور کس کو کہ ہے نود بود کی یاں
ہو جائے حال کیا، مرے بے ساں حال کا

ہم مر بھی جائیں، نشو و نما سے نہ جائیں گے
روئیدگی پہ قرض ہے یاں بال بال کا

پرسش تو میری سال بہ سال اب کرے بھی کیا
امسال بھی ہے حال وہی پارسال کا

جو تھے وہی کوائفِ زنداں ہیں اور یاں
ان روزنوں کا نرخ تیز ہے روزن کے مال کا

اہلِ کمال کا ہے اک انبوہ اور میں
شاعر کمال کا ہوں، نہ عاشق کمال کا

○

راز جو اب تک سربستہ تھے، عنوانوں تک آ پہنچے
صبحِ نو کے روشن لمحے، شب خانوں تک آ پہنچے

کتنے عنواں لرزاں ترساں، لوح و قلم تک ہیں محفوظ
کتنے عنواں خوں میں غلطاں، افسانوں تک آ پہنچے

مصر کے بازاروں سے کتنے یوسف آ کر لوٹ گئے
کتنے یوسف چاک بداماں، کنعانوں تک آ پہنچے

کانپ رہے ہیں آہن پیکر زنجیروں کے پیچ و خم
آزادی کے دیوانے کیا، زندانوں تک آ پہنچے

کتنے رستے میخانوں سے دار و رسن تک جاتے ہیں
ہاتھ ہمارے پھر بھی ساقی' پیمانوں تک آ پہنچے

آج بغاوت برپا کرنے جام و مینا اٹھے ہیں
راز ہماری تشنہ لبی کے' میخانوں تک آ پہنچے

رنگ و رس کے بادل برسے صبح بہاراں جاگ اٹھی
شیشے لے کر روپ سندیسے' ویرانوں تک آ پہنچے

O

محفل اس شوخ کے خیال کی ہے
کیفیت ہے کہ وجد و حال کی ہے

میں ہی یہ بوئے خوش نہ پہچانوں؟
یاسمیں سن جمال کی ہے

صبح نو کی شفق تو دیکھ ذرا!
یہ جھلک اس کی سرخ شال کی ہے

ہے خرابے میں ایک شور بپا
گفتگو اس کے خد و خال کی ہے

میر مجلس کو جو قبول نہیں
ساری مجلس اسی خیال کی ہے

بیر مرہم سے جس قدر ہے مجھے
ہوس اتنی ہی اندمال کی ہے

رنگ سرشار ہیں در و دیوار
اس کی انگڑائی تو کمال کی ہے

رنگ جو اب ہے رنگِ عارض کا
یہ عطا شوخیٔ سوال کی ہے

سیلِ خوں سے گزر دلِ مشتاق
یہی اک راہ اب وصال کی ہے

میرؔ کو اس یقیں سے شاد رکھو
کہ ہمیں جستجو محال کی ہے

دیکھ لوں زخم تازہ واروں کو
قوم یہ کفر کے مآل کی ہے

ہیں زرِ قلب کچھ اناالحق مست
یہ جماعت تو اہلِ قال کی ہے

○

سخن کیوں یار ہی پہ بار ٹھیرے
کوئی بزمِ سخن ہے یار ٹھیرے

سو اب میں بے محل ہو جاؤں خاموش
کہ خاموشی مری گفتار ٹھیرے

یہ رشتے ہیں کہ رشتوں کی شکستیں
کسی دن تو کوئی تکرار ٹھیرے

گلہ مندوں نے اُن کو دھوپ جانا
یہاں جو سائے ہے دیوار ٹھیرے

میں اُس پر جان بھی واروں تو یارو!
مرا جاں وارنا بھی وار ٹھیرے

ہماری گھر میں گنجائش کہاں تھی
کہ ہم تو گھر کے اک معمار ٹھیرے

○

اب تو یہاں یونہی سی گزر چاہتا ہے دل
کچھ دن کے بعد خود سے سفر چاہتا ہے دل

دریائے خواب ہے کہ رواں ہے ہمیشہ میں
اور اب کسی بھی موج میں گھر چاہتا ہے دل

قسمت تھیں سر کی دانش و دیوانگی بہم
اب تو حساب بھی سر چاہتا ہے دل

جانے یہ حرص عقل ہے یا خواہش جنوں
دیوار میں نگاہ کی در چاہتا ہے دل

اس کہنہ شہر گاہِ وصال و فراق سے
اب ایک بار تند گزر چاہتا ہے دل

سن لوں گا اس کی بات کہ اک بات تو ہوئی
تیرے سوا کسی کو اگر چاہتا ہے دل

اب تو ہر اعتبارِ یقین و گماں سے جونؔ
آشوبِ بے دلی میں سفر چاہتا ہے دل

اب اس کو اپنی آن کی اک آن چاہیے
ترکِ حسابِ شام و سحر چاہتا ہے دل

کوئی خبر نہیں ہے لبِ ہست و بود پر
بس اب یہی تو ایک خبر چاہتا ہے دل

ہاں یہ جہاں نہیں دل و دانش کا "ہاں نہیں"
اب اس جہاں کو زیر و زبر چاہتا ہے دل

○

ہوں شہروں شہروں آوارہ، تم جانے کس شہر میں ہو
میں پھرتا ہوں مارا مارا، تم جانے کس شہر میں ہو

بس اک ویرانی پھیلی ہے "دلِ اندر" سے دیدہ تک
مجھ میں ہو کیسے میرا گزارا، تم جانے کس شہر میں ہو

اس جانب کیا گزری آخر، اس کی خبر تو لینی تھی
دشت ہوا "دلِ شہر" ہمارا، تم جانے کس شہر میں ہو

ماہ و سال کہاں میں گزرے اور کہاں برباد کیا
جانے کیا ہے نام تمہارا، تم جانے کس شہر میں ہو

تم کو دیار جاں میں ڈھونڈا یعنی ہم اپنی جاں سے گئے
وقت تھا غارت جانا سارا، تم جانے کس شہر میں ہو

○

وہ اِدھر آئے لالہ کار، اے کاش
دیکھ لیں ہم بھی وہ بہار، اے کاش

یوں جوانی تباہ کرنے کا
مجھ کو ہوتا نہ اختیار، اے کاش

وصل یک حال، ہجر صد احوال
ابھی رہتا یہ انتظار، اے کاش

ہم کو بھی کوئی عذر ہاتھ آئے
ہو وہ اوروں سے ہمکنار، اے کاش

ذمہ دار وجود کوئی نہیں
کوئی مل جائے ذمہ دار اے کاش

وحشت انگیز ہے یہ بے طرفی
ہم ہوں اپنے ہی جنبہ دار اے کاش

○

ہم کہ دل زندہ ہیں اے نکہتِ نازاں اب کے
نہیں چھوڑیں گے ترا گوشۂ داماں اب کے

کوچۂ زلفِ درازاں میں رچا لیں گے جنوں
دشت و صحرا میں پھریں گے نہ پریشاں اب کے

آچلی درد کی لذت میں اب اک پیشروی
آزمائیں گے ذرا لذتِ درماں اب کے

ہم تری سیرگہِ رنگ میں اے رنگِ خرام!
ہو لے آئیں گے ترے ساتھ خراماں اب کے

میں ترے در پہ لگاؤں گا کچھ اس طور صدا
دیکھیو رقص کریں گے ترے دربان اب کے

ہمہ تن رنگ ہے تو، میں بھی عجب رنگ میں ہوں
آئے گا شہر میں اک رنگ کا طوفان اب کے

ساز ہاتھوں میں لیے رہیو تو اے مطربِ جاں!
آؤں گا رقص کناں تیری طرف، ہاں! اب کے

اس کی آنکھوں کا نگاہوں کو مری ہے یہ پیام
ہوں گے افشاں کے ستارے سرِ مژگاں اب کے

تیرے خلوت سے میں اس بار نہ واپس آؤں
تو مجھے دل میں ہی رکھ لیجیو جاناں اب کے

خیمہ زن دل میں بھی ہے دید کی سرشار بہار
آپ ہی آپ ہیں سرکار! بہاراں اب کے

○

مجھ پہ ہے اسے بڑا بھروسہ
فریاد کہ بے ثبات ہوں میں

خود پر تو مجھے یقیں نہیں ہے
تم پر ہی یقین کر سکوں میں

آواز ہے ذات کا تموج
جب تک بھی ہو بولتا رہوں میں

ہے وقت حریفِ وضعِ صورت
لمحات میں ریزہ ریزہ ہوں میں

ہاں، اے لبِ خود نگر و گریہ وا!
کیا تیرے لبوں کو پا لوں میں

○

سارے رشتے توڑ کر آیا
دلِ برباد اپنے گھر آیا

آخرش خون تھوکنے سے میاں
بات میں تیری کیا اثر آیا

تھا خبر میں زیاں دل و جاں کا
ہر طرف سے میں بے خبر آیا

اب یہاں ہوش میں کبھی اپنے
نہیں آؤں گا، میں اگر آیا

میں رہا عمر بھر جدا خود سے
یاد میں خود کو عمر بھر آیا

وہ جو دل نام کا تھا ایک نفر
آج میں اس سے بھی مکر آیا

مدتوں بعد گھر گیا تھا میں
جاتے ہی میں وہاں سے ڈر آیا

○

دیدہ حیران اس گلی میں ہے
کیا عجب شان اس گلی میں ہے

بات میں جان سے گزر جانا
کتنا آسان اس گلی میں ہے

اور اک بار مجھ کو جانے دو
سارا سامان اس گلی میں ہے

کیا خبر ان محل نشینوں کو
اپنی جو آن اس گلی میں ہے

کیا بتاؤں ہے کیا وہ جان گلی
میری تو جان اُس گلی میں ہے

میں کہیں بھی رہوں، کہیں جاؤں
دل کا رجحان اُس گلی میں ہے

وہی دیوار و در، وہ میرا گھر
وہی دالان اُس گلی میں ہے

میں جو کافر ہوں اُس گلی باہر
میرا ایمان اُس گلی میں ہے

اُس گلی پہ ہوں جان سے قربان
میری پہچان اُس گلی میں ہے

○

گلوں پہ حسنِ رقم کا گماں گزرتا ہے
ترے نقوشِ قدم کا گماں گزرتا ہے

شبابِ دوست کی خلوت عجیب ہے کہ جہاں
سپردگی پہ بھی رم کا گماں گزرتا ہے

ہم اس جہاں سے تمہارے جہاں تک آئے ہیں
جہاں خوشی پہ بھی غم کا گماں گزرتا ہے

ترے قریب، ترے التفات کے باوصف
مئے نشاط پہ سم کا گماں گزرتا ہے

مجھے جنونِ محبت کی بے نیازی ہے
نیاز جاہ و حشم کا گماں گزرتا ہے

خلوصِ میکدۂ حسنِ یار پر بھی ہمیں
فریبِ دیر و حرم کا گماں گزرتا ہے

مرے قبولِ محبت کے بعد سے اُن کو
مرے ستم پہ کرم کا گماں گزرتا ہے

ترے سکوتِ حیا پر ہمیں کئی دن سے
قرار و قول و قسم کا گماں گزرتا ہے

ہزار "دلکشی" پر بھی جنوںؔ ہے دلبر
"صنم شکن" پہ "صنم" کا گماں گزرتا ہے

○

دل کی ہر بات دھیان میں گزری
ساری ہستی گمان میں گزری

ازل داستاں سے اس دم تک
جو بھی گزری اک آن میں گزری

جسم مدت تری عقوبت کی
ایک اک لمحہ جان میں گزری

زندگی کا تھا اپنا عیش مگر
سب کی سب امتحان میں گزری

ہائے! وہ ناوکِ گزارش رنگ
جس کی جنبش کمان میں گزری

وہ گدائی گلی عجب تھی کہ واں
اپنی اک آن بان میں گزری

یوں تو ہم دم بہ دم زمیں پہ رہے
عمر سب آسمان میں گزری

جو تھی دل طائروں کی مہلتِ بود
تا زمیں، وہ اڑان میں گزری

بود تو اک گمان ہے، سو خدا!
تیری بھی کیا گمان میں گزری

O

طور یہ پسند آئے دل کو شہر والوں کے
جیب میں لیے پھرے مرحلے خیالوں کے

کیسے کیسے جھگڑے ہیں، اس شکستہ حالی میں
ہم شکستہ حالوں سے، ہم شکستہ حالوں کے

وار کرنے والو! آؤ، آکے مرہمی فرماؤ
ہم نے زخم کھائے ہیں، جانے کتنی ڈھالوں کے

پامال کرتے ہیں نقش پا ہمیں کیا کیا
اپنی پامالی میں، اپنے پامالوں کے

دل پہ خوش جوابی کے جانے کیا گزرتی ہو
ایک جنبشِ لب میں جیت ہیں سوالوں کے

بے کلہ گزرتی ہے، ہم بھلے گزاروں کی
بے محل دعا گو ہیں، بے سخن غزالوں کے

شوق بے مثالی میں، ہے یہ روزگار اپنا
ہیں زباں کا روزینہ، نام بے مثالوں کے

جانے کن اندھیروں میں، تم نے چھاؤنی کی
تم اجڑنے والے تھے، خواب تھے اجالوں کے

○

مت پوچھو جو رقص کے مستوں کی تھی حالت، رات گئے
رقصِ تمنا میں برپا تھا شورِ قیامت، رات گئے

وہ حلقہ بے احوالوں کا، یار عجب کچھ حلقہ تھا
سب کو تھی بے احوالی میں، سب سے محبت، رات گئے

زندہ دلوں کی فریادوں سے، مغموم رہی تھی دل محفل
محو تھا اک حسرت مندوں کا، حرفِ شکایت، رات گئے

سب ہم محفل دھیان سے اپنے دھیان لگائے بیٹھے تھے
دھیان کا خوش قامت کرتا' اپنا قامت' رات گئے

وعدہ بے میعاد تھا اُس کا اور رہی تھی رات بہت
یوں سمجھو وصلت ایسی تھی' رات کی فرقت' رات گئے

○

اپنا وہم، اپنا گماں چاہا گیا
تجھ کو اے جاناں! کہاں چاہا گیا

اپنے یاروں کے لیے اک ذکر تھے ہم
روز اک طرزِ بیاں، چاہا گیا

میں تو چلا آگ لے کر اور یہاں
میری جیبوں میں دھواں چاہا گیا

زندگی تھی اپنے ہونے کا گماں
اپنے ہونے کا سماں چاہا گیا

تیرہ و تاری ' خلا کے درمیاں
روشنی کو بے اماں پایا گیا

پھر کہاں تھا وصل کا امکان جب
مجھ کو میرے درمیاں پایا گیا

رنگ تو جم کر رہا اڑنے پہ بھی
تتلیوں کو بے نشاں پایا گیا

*منصور زبیری کے شرابی آغوش میں

(۳۱ویں اگست ۱۹۹۳ء)

سامنے ہو کے نشیں ہم
تو بھی اے جانِ جاں! کہیں ہم

تم بھی اکثر کہیں نہیں ہوتے
میں بھی اکثر کہیں نہیں ہم

زندگی اپنی، جستجو ہے تری
تو جو ہے جان، تو کہیں ہم

دل سے بس ایک بات کہہ دیجے
دل کا چاہا ہوا، نہیں ہم

تو قیامت کا بے مروت ہے
میں ترا ہم نفس نہیں ہوں

بات کرتے ہیں سنگ و در کی بھی
کوئی خونیں جبیں نہیں ہوں

کوئی بھی دل ربا و دلبر ہو
دل سے بڑھ کر حسیں نہیں ہوں

جونؔ! آغاز مے گساری میں
نشہ ہوں ہے، پھر نہیں ہوں

تم نہیں چاہتے مرا ہوں
چلو اچھا ہے، میں نہیں ہوں

• [illegible]

قطعات

اپنی انگڑائیوں پہ جبر نہ کر
مجھ پہ یہ قہر ٹوٹ جانے دے
ہوش میری خوشی کا دشمن ہے
تو مجھے ہوش میں نہ آنے دے

○

تیز رو، جنگلوں کی رات اور میں
جانے اس وقت کیا بجا ہو گا
اس کی دوری میں ہیں سفر درپیش
جو مری راہ دیکھتا ہو گا

○

پردہ داری کے ساتھ ہم دونوں
کیسے خاکوں میں رنگ بھرتے ہیں
نام لیتے ہوئے محبت کا
میں بھی ڈرتا ہوں' وہ بھی ڈرتے ہیں

○

کچھ لمحوں سے ٹوٹ پھوٹ کے میں
تیری باہوں میں آن پڑتا ہوں
کن صفوں میں شریک ہو کے لڑوں
اب تو میں بس تجھی سے لڑتا ہوں

○

تھی ستارہ نشاط جہاں یہ گلی
ہم نے کچھ دن یہاں گنوائے تھے
جانے کس حال میں تھا میں اک شام
لوگ کچھ پوچھنے کو آئے تھے

○

محرومی سی محرومی ہے، ناکامی سی ناکامی
غم تو دیوانہ کر دے، اچھے خاصے فرزانے کو
جون تو اک دیوانہ ٹھہرا اور پھر کیا دیوانہ
دیکھو جانے کیا کر بیٹھے، روکو اس دیوانے کو

○

انجمن کی اداس آنکھوں سے
آنسوؤں کا پیام کہہ دینا
مجھ کو چاچا کے لوٹنے والو
سب کو میرا سلام کہہ دینا

(۳۰ ویں دسمبر ۱۹۵۷ء ملتان امروہہ)

○

سفری ہوں میں پہ یہ مشکل ہے
پاس میرے سفر کی زاد نہیں
تم مرا خواب، میری ذات تھیں تم
نام کیا ہے تمہارا، یاد نہیں

○

اے سب کے خدا! سخن کہے جا
بہتر ہے یہی کہ میں نہ بولوں
اب ایک ہی میری آرزو ہے
وہ یہ ہے کہ کچھ بھی میں نہ سمجھوں

○

میں تو کب کا گزر چکا خود سے
تم بھی خود سے گزر تو سکتی ہو
کوئی درماں دل نہیں لیکن
تم مری جان! مر تو سکتی ہو

○

ان کے رخ کو حیا کی سرخی کا
ایک پیغام آنے والا ہے
بس وہ گھبرائے، بس وہ شرمائے
اب مرا نام آنے والا ہے

○

بجا کہ ہم بھی یہیں آئے ہیں واعظ
مگر جناب تو پہلے سے آئے بیٹھے ہیں
حساب سود و زیاں ہم سے کیا اور اب کیا
کہ ہم وہ ہیں جو تمہیں بھی گنوائے بیٹھے ہیں

○

میں سوچتا ہوں کہ تیرے شباب رنگیں میں
بجز تمازتِ تزئیں کے سوا کیا ہے
ذرا بتا تو سہی، اے حسینۂ زرکار!
کہ تیرا حسن حیا تیں کے سوا کیا ہے

○

محبت میں وفا کا ذکر کیا کر
میں اپنا فرض پورا کر چکا ہوں
مجھے ہی پوچھنے کو آئے ہیں آپ
مگر، میں تو شاید مر چکا ہوں

○

اب میں سمجھا ہوں تلخی کیا ہے
اب تمہیں بھی مرا خیال نہیں
ہائے! یہ عشق کا زوال کہ اب
ہجر میں ہجر کا ملال نہیں

○

اے رفیقانِ انکسار پسند!
جاہلیت سے میں نے کام لیا
ان حسینانِ قصرِ دولت سے
میں نے تم سب کا انتقام لیا

○

رونقِ دل ترے زمانے میں
رسم ہی کیا نباہنی ہوتی
مسکرائے ہم اس سے ملتے وقت
رو نہ پڑتے اگر خوشی ہوتی

نظمیں

زماں

آسمانوں میں خداوند ازل سے گم تھا
آسمانوں کے تحیّر کی فراخی کا سکوت
سوچتا تھا کہ خداوند کہاں ہے آخر؟
اور اس سوچ نے اس "دیر" کو آغاز کیا
اور اس "دیر" نے اس "زود" کو آغاز کیا
جو زماں ہے، جو خداوند کی نابودی ہے

قاتل

سنا ہے تم نے اپنے آخری لمحوں میں سمجھا تھا
کہ تم میری حفاظت میں ہو، میرے بازوؤں میں ہو
سنا ہے بجھتے بجھتے بھی تمہارے سرد و افسردہ لب سے
ایک شعلہ، شعلۂ یاقوت فام و رنگ و اقلیمِ فروغِ زندگی آہنگ لپکا تھا
"ہمیں خود میں چھپا لیجے"
یہ میرا دو عذابِ جاں ہے جو مجھ کو
مرے اپنے خود اپنے ہی جہنم میں جلاتا ہے

○

تمہارا سینۂ سیمیں
تمہارے بازوانِ مرمریں
میرے لیے
مجھ اک ہوس ناک فرومایہ کی خاطر
"ساز و سامانِ نشاط و ذوقِ عشرت فروشی" تھے
مرے عاشق لفظوں کی فسوں گری جنونی کے لیے
صد لذت آگیں صد کرشمۂ بے زبونی تھے

○

تمہیں میری ہوس پیشہ
مری سفاک قاتل بے وفائی کا گماں تک
اس گماں کا ایک وہم خود گریزاں تک نہیں تھا
کیوں نہیں تھا، کیوں نہیں تھا، کیوں؟
کوئی ہوتا، کوئی تو ہوتا
جو مجھ سے مری سفاک قاتل بے وفائی کی سزا میں
خون تھکواتا
مجھے برسوں کی سولی پہ لٹکاتا
مگر فریاد کوئی بھی نہیں کوئی ......

ورنہ اتفاق کوئی بھی ——

○

مجھے مغرور ہونا چاہیے تھا
اور میں ستارے کے قاتل سے وفا خون ریز تر ہے میں
شہر میں خود وارداتی، شہر میں خود مست، آزادانہ پھرتا ہوں
نگار خانۂ آسودہ!
بہار خانۂ آسودہ!

اے شہر! تیرے اہلِ قلم بے ضمیر ہیں

اے شہر! تیرے اہلِ قلم بے ضمیر ہیں
ہم جو عظیم لوگ ہیں، ہم بے ضمیر ہیں

اے دخترانِ شوخ و بدن صندلینِ شہر
ہم لوگ التفات کے قابل۔ نہیں نہیں
زنہار ہم کو وصل سے کرنا نہ شاد کام
ہم حسن کی زکات کے قابل۔ نہیں نہیں

ہم سب تمہارے سر کی قسم، بے ضمیر ہیں
اے شہر! تیرے اہلِ قلم بے ضمیر ہیں

ہم کافروں کی بات کا کیا تھا کہ اعتبار
اپنی ہر اک غزل میں رواں ہیں بہ سوئے دار
یوں دیکھیے تو دیر و حرم سے ہمیں ہے عار
ورنہ وہ ہم ہیں دیر و حرم کے وظیفہ خوار

ہم پاسبانِ دیر و حرم ، بے ضمیر ہیں
اے شہریار تیرے اہلِ قلم بے ضمیر ہیں

روحِ عوام ، زخم ہے ، ہم غزل کہیں
اک شہر سوگوار رہے ، ہم غزل کہیں
اک خلق دیا درد کہے ، ہم غزل کہیں
محنت کشوں کا خون بہے ، ہم غزل کہیں

کیا رہ گیا ہمارا بھرم ، بے ضمیر ہیں
اے شہریار تیرے اہلِ قلم بے ضمیر ہیں

ہم اک عجب فریب سے کرتے ادب کا کام
اے سامعین! تم پہ مسلط ہیں صبح و شام
جو بولنے کا وقت تو گونگے بنے رہیں
اہلِ سخن ہیں اور سخن کے نمک حرام

ہم وہم بھریں گے فن کا یہ دم؟ بے ضمیر ہیں
اے شہر! تیرے اہلِ قلم بے ضمیر ہیں

باطل پرست، حرفِ ادا حق کے سود خوار
ہم بیچ کھائیں سرمد و منصور کے مزار
بعد از وقوعِ واقعہ سینہ زنی میں طاق
یہ سر بودو تو سارے زمانے کے سوگوار

ہم ماہرانِ پیشۂ قلم، بے ضمیر ہیں
اے شہر! تیرے اہلِ قلم بے ضمیر ہیں

ہم نسل سے ہیں ابنِ بطوطہ کی بالیقیں
روداد ہم سے سنئے کسی ماحضن کی سنو
یہ مت سنو کہ شاہ کا بندوں سے کیا ہے طور
تعریف صرف شاہ کے آئین کی سنو

یہ داد اپنے حق سے ہے کم، بے ضمیر ہیں
اے شہر! تیرے اہلِ قلم بے ضمیر ہیں

یہ ناقدینِ شعر، ادب کے معلمین
اکثر غلط ہو جن کا تلفظ بھی قارئین

یہ لوگ آسمان و زمیں میں کہیں نہ ہوں
نکلے جو آسماں تو نگلے انھیں زمین

تفصیل کیا کروں میں رقم، بے ضمیر ہیں
اے شہر! تیرے اہلِ قلم بے ضمیر ہیں

میں شہرِ امتحاں میں پھرا ہوں گلی گلی
اہلِ وفا کے ساتھ گیا ہوں گلی گلی
تھی جن کو فرطِ شوق میں گل کی جستجو
میں ان کے ساتھ ساتھ رہا ہوں گلی گلی

غائب تھے ان کے نقشِ قدم، بے ضمیر ہیں
اے شہر! تیرے اہلِ قلم بے ضمیر ہیں
ہم جو عظیم لوگ ہیں، ہم بے ضمیر ہیں

ایک گروہ

ایک گروہ ہے کہ ہے' بے خطر اور بے سپر
ایک بریدہ پا نمود' ایک بریدہ سر وجود
اپنے سوال کا زیاں' اپنے جواب کا ضرر
بار زمیں ہے اور' ہے بار زماں ہے اور
خون شدگی کی اشتہا' زرد و زبون و پُرزیاں
خون پدر کا ریسماں خوار و خزیدہ و خجل
خون نہیں ہے کوئی لوح' خون نہیں کوئی قلم
خون نہیں کوئی قضا' خون نہیں کوئی قدر
خون کوئی خدا نہیں' جو بھی رائیگاں نہ جائے

نقشِ کہن

شانوں پہ کس کے اشک بہایا کریں گی آپ
روٹھے گا کون، کس کو منایا کریں گی آپ
وہ جا رہا ہے صبحِ محبت کا کارواں
اب شام کو کہیں بھی نہ جایا کریں گی آپ
اب کون "خود پرست" ستائے گا آپ کو
کس "بے وفا" کے ناز اٹھایا کریں گی آپ
پہروں شبِ فراق میں تاروں کو دیکھ کر
شمعیں جلا جلا کے بجھایا کریں گی آپ
گم صم اُلجھنوں میں گزاریں گی رات دن
بیکار اپنے جی کو جلایا کریں گی آپ

اب "لذتِ سماعتِ رہرو" کے واسطے
اونچے سُروں میں گیت نہ گایا کریں گی آپ
ہمجولیوں کو اپنی بسوزِ تصورات
ماضی کے واقعات سنایا کریں گی آپ
اب وہ شرارتوں کے زمانے گزر گئے
"چوکے کا کون" کس کو ڈرایا کریں گی آپ
فرقت میں دورِ گوشہ نشینی بھی آئے گا
ملنے سہیلیوں سے نہ جایا کریں گی آپ
غصے میں نوکروں سے بھی الجھیں گی بار بار
معمولی بات کو بھی بڑھایا کریں گی آپ
پھر اس کے بعد ایک وہ منزل بھی آئے گی
دل سے مرا خیال بھلایا کریں گی آپ
حالاتِ نو بہ نو کے مسلسل ہجوم میں
کوشش سے اپنے جی کو لگایا کریں گی آپ
آئے گا پھر وہ دن بھی تغیر کے دور میں
دل میں کوئی خلش ہی نہ پایا کریں گی آپ
"مشقِ سخن" کو دل سے مٹانا ہی چاہیے
گزرے ہوئے دنوں کو بھلانا ہی چاہیے

اُن کا جواب

جب آپ کو قریب نہ پایا کروں گی میں
روٹھوں گی خود سے خود کو منایا کروں گی میں
اب میرے آنسوؤں کی پناہیں نہیں رہیں
اب اپنے آنسوؤں کو چھپایا کروں گی میں
رخصت ہوا ہے "صبحِ محبت کا کارواں"
اب کس کے پاس شام کو جایا کروں گی میں؟
ہاں "وہ شرارتوں کے زمانے گزر گئے"
اب حسرتوں کے داغ اٹھایا کروں گی میں
ہاں اب کسی "سماعتِ ہمسایہ" کے لیے
اونچے سُروں میں گیت نہ گایا کروں گی میں

مطلب ہی اب نہیں ہے کسی بات سے مجھے
اب بات بات کو نہ بڑھایا کروں گی میں

"انجام" کے اداس اندھیروں میں بیٹھ کر
"آغاز" کے چراغ جلایا کروں گی میں

بھولیوں کو اپنی بے سوز تصورات!!
ماضی کے واقعات سنایا کروں گی میں

حیرت ہے آپ کا مرے بارے میں یہ خیال
دل میں کوئی خلش ہی نہ پایا کروں گی میں؟

شکلیں بنا بنا کے مٹایا کریں گے آپ
شکلیں بنا بنا کے بنایا کروں گی میں؟

حالات سے تباہ یہ کیا کر رہے ہیں آپ!!
حالات کا مذاق اڑایا کروں گی میں؟

کیا ہو گئے ہیں آپ بھی کچھ مصلحت پسند!!
کیا اب فریب ہجر ہی کھایا کروں گی میں؟

کیا اضطراب روح بھی برباد ہو جائے گا!!
کیا یونہی اپنے دل کو جلایا کروں گی میں؟

ہے اس روش کا نام اگر زندگی تو پھر!!
خود زندگی کو بھینٹ میں لایا کروں گی میں؟

بس آپ ہی نہ دیجیے یہ مشورے مجھے
ہیں اور بھی ستم جو اٹھایا کروں گی میں
"نقشِ کہن" کو دل سے بھلایا نہ جائے گا
گزرے ہوئے دنوں کو بھلایا نہ جائے گا

انبوہ

ایک بستی ہے، آدمی ہیں دو
ایک تو میں ہوں، اور دوسرا میں
گھر سے نکلا ہوں، دیکھیے کیا ہو
صحرا دیکھ کر چلا گیا

صفازادہ

ابنِ شاذان مسجد سے باہر نکل کر
گلوگیر آواز میں مجھ سے گویا ہوا:
یا اخی! میں زنازادہ ہوں

میں ضمیر کے "ا" سے آئینہ وار نکلنے لگا
غمِ فردوس کی جنتوں کی خوشبو کی سوگند
میرا عجب حال تھا

ہاں! میں ہوں..... یا اخی! میں زنازادہ ہوں
اس نے ڈرا کے مجھ سے کہا

اور پھر وہ جو رو دیا ہے ...... بس کیا کہوں
اتنا رویا کہ ریش سیاہ اس کی اشکوں سے تر ہو گئی

ہم ذرا دیر کے بعد آگے بڑھے
رات تاریک تھی
سوقِ علاف کے چوک تک اس کی آواز روتی رہی
اور میں تھا کہ افسردہ دل اور خاموش
اس کو سہارا دیے چل رہا تھا

اور اس بعد میں نے تکلم کیا
یا اخی! تو زنا زادہ ہرگز نہیں
تو صفا زادہ ہے
پر تجھے اپنی مادر کے حق کی قسم
تو بھی اپنا وہ وعدہ نبھا
کہ جس کی محبت میں
تجھ کو صلیب اپنی خود ہی اٹھانی پڑے

وہ میری بات سنتے ہی یک دم رُکا
اب کچھ ایسا تھا جیسے وہ حاضر بھی ہو اور غائب بھی
پھر چپ و راست اُس نے کچھ اس طور دیکھا
کہ میں کچھ اُلجھ سا گیا
جانے کیوں!
مجھے اُس کی آنکھوں میں بیگانگی سی نظر آ رہی تھی
ازاں بعد وہ قہقہہ مار کر مجھ کو تکنے لگا

میں نے دیکھا
تو کیا دیکھتا ہوں
کہ اب اُس کے چہرے پہ آنکھیں نہیں ہیں
وہاں دو بھڑکتے ہوئے شعلے ہیں
اور میں ڈر گیا

شہید چوک کے نام

شہید چوک! وفا کو ترا سلامی ہے
میں تیری خاک کو تعظیم دینے آیا ہوں
دیارِ وقت کی خوں گشتہ عظمتوں کے لیے
میں تیرے خون کا پیغام لینے آیا ہوں

○

ابھی سے زرد ہے چہرہ نظامِ دولت کا
ابھی تو جوشِ بغاوت کو عام ہونا ہے
شہید چوک! ترے ولولے جوان رہیں
ابھی تو رسمِ شہادت کو عام ہونا ہے

○

سیاہ رات! وہ سورج ابھرنے والا ہے
جو انقلاب کا پرچم فضا میں کھولے گا
زمین، حشر اٹھائے گی ظالموں کے خلاف
یہ خون چپ نہ رہے گا، یہ خون بولے گا

○

سنو کہ ظلم کی دیوار گرنے والی ہے
وہ دور آکے رہے گا، وہ دور آئے گا
چھڑی ہوئی ہے لڑائی اور اس لڑائی میں
شہید چوک! ترا خون فتح پائے گا

تمنا

ہر نفس، سوزِ تمنا سے عبارت ہے وجود
کربِ صد شوقِ تمنا کی حکایت ہے وجود
نغمۂ وقت اک آہنگِ تمنا ہی تو ہے
یعنی جو کچھ ہے وہ نیرنگِ تمنا ہی تو ہے
زندگی یوسفِ فطرت کی زلیخائی ہے
اک تمنا ہے کہ خود اپنی تمنائی ہے
یہ مشیت تھی کہ آدم کو سزا دی جائے
یعنی دیوانے کی وحشت کو ہوا دی جائے
شوقِ سرگشتہ کو سرگشتۂ مقسوم کیا
دل کے صفحے پہ تمناؤں کو مرقوم کیا

دل کی تقدیر ہے مجبورِ تمنا ہونا
ہر نفس، تازہ تمنا کا خود آرا ہونا
اس تسلسل میں کہیں وقفۂ آرام نہیں
ایک آغازِ مسلسل ہے اور انجام نہیں
اس تسلسل کو بدلنے کی تمنا ہے مجھے
جبر کی حد سے نکلنے کی تمنا ہے مجھے

روح آزاد ہو، مجبورِ تقاضا نہ رہے
بے تمنا کر مجھے کوئی تمنا نہ رہے

ہجوِ معشوقانِ خود

یہ جو معشوق ہیں مرے دو چار
بدشکل ، بدکلام ، بدکردار
کیا بصوت لفظ ہے معشوق
ہے قوافی میں جس کے اک مغلوق
یہ مرا جبر ہیں ضرورت ہیں
میں کہ نر ہوں یہ مادہ صورت ہیں
خوب سے خوب تر؟ ارے توبہ
جون اور جستجو کرے! توبہ
جو خود آ جائے بس وہ لیلیٰ ہے
ہو، اگر اس کا رنگ میلا ہے

نشے میں کاہلی کے مست ہوں میں
کیجیے ذوقِ نظر میں پست ہوں میں
ویسے میں بھی تو دیدہ زیب نہیں
جسم میرا بھی دلفریب نہیں
ہے مرا عکس، زنگِ آئینہ
ہوں سراپا میں ننگِ آئینہ
پھر بھی اک مسئلہ تو رہتا ہے
نہ کہوں میں پہ دل تو کہتا ہے
جو بھی ہے اپنا دل ربا دل بر
ایک بھی تو نہیں ہے خوش منظر
جمع خاطر ہو کس طرح صاحب
سب کے پیمان حشیۂ غالب
لوحِ تن کا ہے ان کی کاف بھی قاف
قاف، ترشا ہوا پیالۂ ناف
ہم کو پرسے لکھیں تو پرچوں میں
دوسرے شاعروں کے شعر لکھیں
کوئی تمیز ان کو ہے نہ شعور
پاسِ آداب سے ہیں کوسوں دور

ہم تو بس دل لگی کے کام کے ہیں
یعنی شاعر تو صرف نام کے ہیں
جن کے شعروں کی ہم سے داد اٹھو
جا کے ان کی ہی گود میں بیٹھو
دل کی تحریر ہے تمہارا شوق
ہم بھی اب اس قدر نہیں بدذوق

بحرِ ہزج

میں وہ شادروشی یکا یکی سے بے حسابانہ
زبوں تر ہو کے آیا ہوں
میں وہ شادروشی یکا یکی سے
سرنگوں تر ہو کے آیا ہوں

....

غم ملاف سوز اس آسماں سے آسمانوں تک
کسی احساس سے اس کی کنایہ زن گوشش سے بھی
مایہ دور نہیں کرتا
کوئی بھی لمحہ دوسرے کو سر نہیں کرتا

....

پیاپے آب سے اب تک ایزداں ایزد ہے
اہرمن ہے اور ان میں سے اک میں ہوں
مگر ہم میں سے آخر اپنا ہونا اور ہو سکنا
گمانوں کے گماں میں کون سہہ پائے گا
آخر کون؟
یعنی کون سہہ پایا؟

سوال از خود، سوال از خود
ملال از خود، ملال از خود
عذاب صد عذاب از خود
جواب از خود، جواب از خود

''مگر ان کا کوئی آہنگ تو ہوگا
حق آگیں خوشی کا کوئی نیرنگ تو ہوگا؟''
''فقط بحرِ رجز! یعنی:
مفاعلن، مفاعلن، مفاعلن، مفاعلن''

۵۹

وہ کتابِ حسن، وہ علم و ادب کی طالبہ
وہ مہذب، وہ مؤدب، وہ مقدس راہبہ
کس قدر پیرایہ پرور اور کتنی سادہ کار
کس قدر سنجیدہ و خاموش، کتنی باوقار
گیسوئے پُر خم، سوادِ دوش تک پہنچے ہوئے
اور کچھ بکھرے ہوئے، اُلجھے ہوئے، سمٹے ہوئے
رنگ میں اُس کے عذابِ تیرگی شامل نہیں
کیفِ احساسات کی افسردگی شامل نہیں
وہ مرے آتے ہی اُس کی نکتہ پرور خامشی
جیسے کوئی حور بن جائے یکایک فلسفی

مجھ پہ کیا، خود اپنی فطرت پر بھی وہ کھلتی نہیں
ایسی پُراسرار لڑکی میں نے دیکھی ہی نہیں
دخترانِ شہر کی ہوتی ہے جب محفل کہیں
وہ، تعارف کے لیے آگے کبھی بڑھتی نہیں

٭

ناکارہ

کون آیا ہے؟
کوئی نہیں آیا ہے' پاگل!
تیز ہوا کے جھونکے سے دروازہ کھلا ہے
اچھا! یوں ہے؟
بیکاری میں ذات کے زخموں کی سوزش کو اور بڑھانے
تیز روی کی راہگزر سے
محنت کوش اور کام کے دن کی
دھول آئی ہے' دھوپ آئی ہے!
جانے یہ کس دھیان میں تھا' میں
آتا تو' اچھا' کون آتا؟
کس کو آنا تھا' کون آتا؟

دیکھتے چلو

وہ کہکشاں، وہ رہ گزر، دیکھتے چلو
جو آن ایک عمر ہو گئی، گھر دیکھتے چلو
رقصاں تھیں زندگی کی طرحداریاں جہاں
دنیائے شوق کا وہ کھنڈر دیکھتے چلو
تاریک ہو گئی ہے نظر عہدِ ہجر میں
طلعتِ نظر کو ایک نظر دیکھتے چلو
شامِ کنارِ بان ہے اب بھی شفق نگار
رنگوں کا موج موج سفر دیکھتے چلو
اک ڈھیر خاک کا ابھی موجود ہے وہاں
وہ طاق، وہ رواق، وہ در، دیکھتے چلو

وہ خواب خواب شہر نگارا ہے پھر تمہیں
پھر ایک بار خواب سحر دیکھتے چلو
سرکار قاربہ کی حریم جاہ کو
خوئیں تو واہ، خاک بسر، دیکھتے چلو
جس کے ترانے میں وہ شیریں بھی تھی شریک
وہ اپنا بے ستون ہنر، دیکھتے چلو
وہ رنگ کے مزار، وہ محبت کی تربتیں
ہے دیکھنا عذاب، مگر، دیکھتے چلو
جون! اس شکستہ آئینہ خانے کے روبرو
آئینہ لے کے دیدۂ تر، دیکھتے چلو!

جوانی

حقیقت خیز تہمت ہے جوانی
اک آلودہ طہارت ہے جوانی
کبھی ہر لمحہ راحت ہے جوانی
کبھی ہر دم مصیبت ہے جوانی
سواد نقطۂ آلام ہو کر
محیط عیش و عشرت ہے جوانی
بقول بعض یاران جواں سال
گناہوں کی شریعت ہے جوانی
بحد ناپاکیٔ احساس و افکار
بیان حسن نیت ہے جوانی

کبھی خود اپنے حق میں سم قاتل
کبھی داروئے علت ہے جوانی
کبھی ہر اک شغل مصروف و مشغول
کبھی فرصت ہی فرصت ہے جوانی
نہ جانے کیوں، نہ جانے کس بنا پر
اک احساسِ ندامت ہے جوانی

دو مشورے

ایک لیڈر نے دیا ہے لیڈروں کو مشورہ
خوب ہی سرکار کو بدنام کرنا چاہیے
ماہرانِ شان سے لکھا کے اعداد و شمار
مفلسوں پر یورش اقدام کرنا چاہیے
اور پریشاں حال ملت کو خلوصِ دل کے ساتھ
نعرۂ وحشت انجام کرنا چاہیے
اپنی ہر تقریر میں ' ہر پارٹی کے واسطے
اہتمام طعن و دشنام کرنا چاہیے
زیبِ تن کر کے سلیقے سے لباسِ مغربی
قوم کی تہذیب کا اکرام کرنا چاہیے

ہو یہ ہر تقریر میں شامل الیکشن کے قریب
آپ سب لوگوں کو مل کے کام کرنا چاہیے
اور مل جائے سفارش بھی تو پرمٹ کے طفیل
تاجروں کو بڑھ کے ذرا دام کرنا چاہیے
دے کے اخباروں میں چندہ پارٹی کے فنڈ سے
شوخ فطرت نرسوں کو رام کرنا چاہیے
بھائیو! اس گفتگو سے خاص کا مطلب یہ ہے
کام تو ہوتا رہے گا، نام کرنا چاہیے
کم سے کم ہو جائے صوبائی وزیروں میں شمار
یہ دعا ہر روز، صبح و شام کرنا چاہیے
برخلاف اس کے ہے میرا مخلصانہ مشورہ
جس کو لوحِ ذہن پر ارقام کرنا چاہیے
رحم کھا کے لیڈروں کو اپنے حالِ زار پر
کم سے کم سو سال تک آرام کرنا چاہیے

بت شکن

لے کے آیا ہوں تمہارے سامنے سینے کے داغ
دیر سے لَو دے رہے تھے بادۂ فن کے چراغ
ایک رہرو جا رہا تھا راستے میں بے خیال
دل کو مستقبل کی امیدوں سے بہلاتا ہوا
تم اچانک آ گئیں اور خاص اک دوراہے کے قریب
اپنی پائل کے ترنم سے اسے چونکا دیا
اور اس سے اگلی منزل کا تصور چھین کر
ایک بے مقصد سفر کے عہد و پیماں کر لیے
اب تمہاری رہبری تھی اور تخیل کا فریب
راستے بدلے گئے اور کارواں بڑھنے لگے

ذہن پہ چھاتا گیا رنگین خوابوں کا فسوں
زندگی کرنے کی خوابوں کے گلزاروں میں رقص
رات کی تنہائیوں میں شہرِ انجم کے سفر
کہکشاں تا کہکشاں نادیدہ سیاروں میں رقص
مجھ کو بخشے تھے انھیں نظروں نے میخانوں کے خواب
عارض و گیسو سے وابستہ شبستانوں کے خواب
ساحلِ آغوشِ مرمریں میں طوفانوں کے خواب
کیا مگر خوابوں کا حاصل، وہ بھی دیوانوں کے خواب
اور پھر وہ دور بھی آیا کہ تم اکتا گئیں
اپنی حد سے بڑھ گئی تھیں، اپنی حد میں آ گئیں
میں فریبِ آرزو کھاتا رہا، جیتا رہا
زہرِ غم پیتا رہا، پیتا رہا، پیتا رہا
چاک کرتی ہی رہیں تم جیب و دامانِ وفا
اور میں سیتا رہا، سیتا رہا، سیتا رہا
جانے کیوں تم مستقل دامن کشاں رہنے لگیں
بے سبب نامہرباں، نامہرباں رہنے لگیں
بھول کر عہدِ نظر جانے کہاں پہنچا خیال
چھوڑ کر شہرِ وفا جانے کہاں رہنے لگیں

آؤ! وہ ناز محبت کا یقین و اعتبار
میں نے تم کو دمبدم آواز پہ آواز دی
پھر حدود حسرت و امید تک ڈھونڈا تمہیں
روح کی وادی میں دل کے ساز پہ آواز دی
لوگ کہتے ہیں اچھا ٹھیک ہی کہتے ہیں لوگ
میں فقط وہموں کی دنیا میں سفر کرتا رہا
میں نے چاہی بجلیوں سے خرمن اندوزی کی داد
پتھروں سے خواہش لطف نظر کرتا رہا
کیا تمہارے شہر میں لے کر دعاؤں کے حصار
نوجوانی کو بچانے کے لیے آیا تھا میں
کیا شعور زندگی کی داد پانے کے بجائے
میکدوں میں لڑکھڑانے کے لیے آیا تھا میں
اب شعور زندگی کو آزمانے دو مجھے
کچھ حجابات مزاج دل اٹھانے دو مجھے
ایک ہی رخ تم نے دیکھا ہے ابھی تصویر کا
آج اس کا دوسرا رخ بھی دکھانے دو مجھے
تم کو اپنایا تھا، تم کو چھوڑ بھی سکتا ہوں میں
منہ بناتا ہی نہیں ہوں، توڑ بھی سکتا ہوں میں

مرگِ ناگہاں

(ماتمِ سیمابی)

• بس کہ لوٹا ہے کارواں تو نے — کیا کیا مرگِ ناگہاں تو نے

وقت کے دلپسند نغموں کو — کر دیا نالہ و فغاں تو نے

• چھین کر ایک جانِ شیریں کو — تلخ کر دی ہے داستاں تو نے

نازِ پروردگانِ دولت کو — کر دیا آج بے اماں تو نے

حیف ہے اے آسماں ترے اوپر — توڑ ڈالا ہے سازِ جاں تو نے

کیا بتاؤں میں کتنی آنکھوں کو — کر دیا آج خوں فشاں تو نے

• آفتابِ جہانِ حکمت کو — اے فلک! کھو دیا کہاں تو نے

یہ خبر، اُف یہ حشر خیز صدا

اس خبر کا یقیں نہیں آتا

[illegible]

• قصرِ انفاس اتنا بے بنیاد — خانۂ مرگ و زندگی برباد
• کیا تکلف ہے یہ نظامِ جہاں؟ — کیا تمسخر ہے عالمِ ایجاد؟
کیسے شاداب پھول کملائے — کیسا آباد گھر ہوا برباد
کیسے لوگ اور ان پہ یہ آفت — کیسے دل اور ان پہ یہ افتاد
جو تھے امداد کرنے والوں میں — آہ! اب وہ ہیں قابلِ امداد
سوگواروں کی زیست کا مقصد — یاد، بس یاد اور کیسی یاد
• دل برباد، عمر بھر آہیں — لب فریاد، عمر بھر فریاد

• آج ہر دل کی آس ٹوٹ گئی
خود مسیحا کی نبض چھوٹ گئی

اعتبارِ حیات کچھ بھی نہیں — کچھ نہیں، کائنات کچھ بھی نہیں
سحر و شام، عشرت و آلام — صرف باتیں ہیں بات کچھ بھی نہیں
ایک شعلہ ہے دن، بس اک شعلہ — اک دھواں ہے یہ رات، کچھ بھی نہیں
سارے اوراق منتشر کر دو — دفترِ واقعات، کچھ بھی نہیں
وہم ہے رشتۂ جسم و جاں، اک وہم — نظمِ ذات و صفات، کچھ بھی نہیں
ایک سازش ہے طالعِ قسمت — حاصلِ التفات، کچھ بھی نہیں
ایک آراستہ جنازہ ہے — زندگی کی برات، کچھ بھی نہیں

چارہ گر ختم ہوں، جتنے ہیں یاد
کچھ نہیں صحت و مرض پہ مدار

کچھ کہو تو، یہ کیا ہوا آخر — کیسے نقشہ بدل گیا آخر
میں نے اُن کو ابھی تو دیکھا تھا — اور ابھی وقت ہو گیا آخر
کچھ کہو تو یہ واقعہ کیا ہے — کچھ بتاؤ تو ماجرا آخر
وہ تو دالان میں کھڑے تھے ابھی — کس طرح آئی یہ بلا آخر
چند لمحوں میں ایک گھر کا نظام — ایسے کیونکر بگڑ گیا آخر
کچھ وصیت بھی کر سکے کہ نہیں — آخری وقت کچھ کہا آخر
وہ سفر کی تکان میں ہوں گے — غور سے دیکھ بھی لیا آخر
[illegible] اقلیمِ سخن کے [illegible] — اے فلک! تجھ کو کیا ملا آخر

آخری بار اُن کو دیکھ چلا
یہ تو میں سوچ بھی نہ سکا تھا

• جونؔ حاضر ہے از پئے تعظیم — حضرتِ عمِّ محترم! تسلیم!
آپ تو سو رہے ہیں حجرے میں — گھر میں برپا ہے ایک شورِ عظیم
آپ کو کاش یہ خبر ہوتی — ہم پہ نازل ہے کیا عذابِ الیم
ہم نے حصے میں صرف غم پایا — آج یوں قسمتیں ہوئیں تقسیم
خلق بارِ غم سے بے کل ہیں — آپ کے پاس ہیں مزاجِ حکیم
آپ کے بعد ان غریبوں کو — کون سمجھے گا لائقِ تکریم
• چند لمحوں میں ہو گئی ویران — عظمتِ فن کی بارگاہِ قدیم

• کیا کہیں، کچھ نہیں ہے کہنے کو
ہائے! کیا غم ملا ہے سہنے کو

عمر بھر یہ کمی نہ آئے گی | یہ کمی عمر بھر نہ آئے گی
غمِ دل اب نہ پائے گا تسکین | حالتِ اصلاح پر نہ آئے گی
چشمِ گریاں! خبر ہے کچھ دل کی | اب بھی تو خوں سے بھر نہ آئے گی
جو ہوا کارواں کے ساتھ گئی | وہ ہوا لوٹ کر نہ آئے گی
سو گئے لے کے آخری ہچکی | اب صدائے ذکر نہ آئے گی
سونگھ لو ان کا تار تار کفن | اب یہ خوشبو اِدھر نہ آئے گی
دیکھنے والے دیکھ لیں صورت | پھر یہ صورت نظر نہ آئے گی

نکہتِ گلشنِ وقار گئی
کتنی یادوں کی یادگار گئی

• لوگ آئے ہیں ان کو چونکا دو | اور ذرا کاغذ و قلم لا دو
• ان کو لکھنے ہیں نسخہ ہائے شفا | قبر میں روشنی تو پہنچا دو
وہ بہت جلد آنے والے ہیں | سب مریضوں کو جا کے سمجھا دو
ان کا دل نرم ہے، بہت ہی نرم | بین کر کے نہ ان کو ایذا دو
لو برآمد ہوئی وہ میتِ خاص | لاؤ! جاؤ بڑھ کے کاندھا دو
خلقتو! ایک صف میں آ جائیں | قلعو! تم ذرا اتروا دو
• اہلِ خانہ! متاعِ شہر تھے وہ | شہر والوں کو جا کے پُرسا دو

• ان کی عظمت کا کچھ حساب نہ تھا
شہر کیا، دور تک جواب نہ تھا

بول ، اے ناسخِ شکیبائی! — کیا ضروری تھا موت کیوں آئی؟

دخل کس کو بھلا مشیّت میں — کیا مشیّت ہے صرف خود رائی؟

کیا ملا تجھ کو اُن کے مرنے سے — کیا بھلا ، کس نے زندگی پائی؟

سب کو جینا ہے ، سب کو مرنا ہے؟ — ڈوب جائے یہ شوق یکتائی!

جبرئیل و خدا کی عمر دراز — اشرف الخلق کی یہ رسوائی!

خواہشِ زیست کس سے بھولی ہے

آتشِ صادقین بھولی ہے

قومی نظمیں

پرتوِ تنویرِ سحر

(۲۳ ویں مارچ ۱۹۵۶ء یوم جمہوریہ پر)

قافلہ آج کہیں سرگرداں تو ہوا
نئے حالات کی تعمیر کا ساماں تو ہوا
لفظِ جمہور پہ گو ہو نہ ابھی نقشِ تکمیل
لوحِ دیوانِ تمدن پہ فروزاں تو ہوا
سایۂ پیکرِ رقاصۂ تدبیر و نظر!
بزمِ تہذیب کی دیوار پہ رقصاں تو ہوا
تیرہ و تار نگاہوں میں شگفتہ ہوا خواب
آج تعبیر کے مطلع پہ نمایاں تو ہوا
سیکڑوں سال کی مکروہ سیاست کا چلن
اپنے ہی دامنِ شفاف میں عریاں تو ہوا
گو فضاؤں میں ابھی کچھ دام بچھے ہیں لیکن
طائرِ شوق فضاؤں میں پرافشاں تو ہوا
یہ بجا ہے کہ ابھی دور ہے منزل لیکن
قافلہ جادۂ منزل میں خراماں تو ہوا

سخت نایاب تھے اسبابِ پریشانیٔ دل
دل کسی "خاص تصور" سے پریشاں تو ہوا
اپنی تاریخ کے اوراق میں بارِ اوّل
نئے ابواب کی تدوین کا ساماں تو ہوا
تیرے اعزاز میں اے شامِ نشاطِ فردا!
آج محرابِ تصور پہ چراغاں تو ہوا
اٹھتے اٹھتے یہ حجابات بھی اٹھ جائیں گے
کوئی در پردۂ دل، سلسلہ جنباں تو ہوا
گو فسردہ ہی سہی روحِ گلستاں پھر بھی
ایک ہنگامہ، بہ عنوانِ بہاراں تو ہوا
گو ابھی تفرقۂ دیر و حرم باقی ہے
پھر بھی اس ضمن میں اک کارِ نمایاں تو ہوا
اب بھی موجود ہے سرمایہ و محنت کا تضاد
ہاں مگر شیوۂ تاویل پریشاں تو ہوا
یہ مگر ایک خبر ہے تو خبر کیا کم ہے
دوستو! پرتوِ نظر کیا کم ہے

اے وطن!

رنگ و فرہنگ و آہنگ کی انجمن
اے وطن! اے وطن! اے وطن!
ارتقائے تمدن کا عنواں ہے تو
یعنی مجموعۂ مصر و یوناں ہے تو
رہبرِ عہد تو تیرا عہد کہن
اے وطن، اے وطن، اے وطن
تو نے پھیلائی عرفان کی روشنی
علم و حکمت کے ایوان کی روشنی
تیری تاریخ ہے مظہرِ فکر و فن
اے وطن! اے وطن! اے وطن!

سر بہ سر جلوہ گاہِ بہاراں ہے تو
ذرہ ذرہ ترا جنتِ آرزو
نازشِ گلستاں تیرے دشت و دمن
اے وطن! اے وطن! اے وطن!

تجھ کو عنوانِ ہستی بنائیں گے ہم
زندگی بھر ترے گیت گائیں گے ہم
رونقِ بزمِ جاں ہے ترا بانکپن
اے وطن! اے وطن! اے وطن!

نگارِ فن

(۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد پہلا تاثر)

بہت لکھا ہے تری زلفِ پُرشکن کے لیے
نگارِ فن! مرے نغمے ہیں اب وطن کے لیے
مرے رجز کی ضرورت ہے رزم گاہوں کو
وداع کر مری بانہوں، مری نگاہوں کو
وفا کا معرکۂ لالہ کار آ پہنچا
حریف، وحشتِ دیارِ بہار آ پہنچا
حریمِ فن کو بچانے کا وقت ہے، یہ وقت
خود اپنے خوں میں نہانے کا وقت ہے، یہ وقت
سپہ ستیز، جوانانِ سیہ تیز چلے
شباب، داد طلب تھا، سو تیز تیز چلے

تمھیں ہیں تیرے وفادار خیر کے ساتھی
ہیں خیر و شر کی لڑائی میں خیر کے ساتھی
یہ معرکہ تو ہے خود اس حرم سرا کے لیے
ترے لیے' تری انگڑائی کی فضا کے لیے
نگارِ من! یہ در و بام ارجمند رہیں
تری گلی کے طرحدار سربلند رہیں
وداع کر مری بانہوں' مری نگاہوں کو
رکے بہار کسی پل' تیری راہوں کو

فروغِ جوہرِ پنہاں

وطن کو شان و شکوہ جہاں مبارک ہو
ہوئی ہے روحِ وفا کامراں مبارک ہو
فروغِ جوہرِ پنہاں ظہور میں آیا
نشاطِ جاذبۂ امتحاں مبارک ہو
ہوئی جہانِ کہن سے جہانِ نو کی نمود
نئے جنون، نیا سازماں مبارک ہو
ہوئی ہے قوم سے اک قومِ زندہ تر پیدا
عمل کی روحِ رواں و دواں مبارک ہو
زندہ تر ہیں نگاہیں، زندہ تر ہے لہو
یہ سوزِ دل، یہ تب و تابِ جاں مبارک ہو

زمیں! زیب ہیں تیرا ترے ذرّہ مرداں
قضا کو فرِ قضا دادراں مبارک ہو
فراز شعلۂ فرش و فریدِ فرش
جلالِ تیغ فریندگاں مبارک ہو
شناوران سرِ موجِ تیز قلزمِ خوں!
شعارِ فخر گراں مایگاں مبارک ہو
تگاوران و تگانندگانِ دشتِ نبرد
نہیبِ تکبر و برگستواں مبارک ہو
تلاطم و ہمہمۂ حرب و حملہ و یلغا
شکوہِ عشرتِ شیرِ ژیاں مبارک ہو
نیازِ دیدہ و دل، اے سرانِ سرانداز!
مبارک، اے صفِ صف شکناں! مبارک ہو
جو اپنے خون سے لکھ کر گئے ہیں سطرِ حیات
انہیں بقا کا نگین و نشاں مبارک ہو
وصالِ ذات کے زانو پہ جو ہوا آخر
ہے وہ نفس، نفسِ جاوداں مبارک ہو
ہو آسمانِ وطن کو تری زمیں کی نوید
زمیں! تجھ کو نیا آسماں مبارک ہو

سخنوروں کا سلام

وفا کے نعرہ زنوں کو سلام کرتے ہیں
ہم اپنے صف شکنوں کو سلام کرتے ہیں

جو دشمنوں کو دبائے ہوئے ہیں، اُن کو سلام
جو اپنے قول میں نبھائے ہوئے ہیں اُن کو سلام
جو کم ہیں پھر بھی جو چھائے ہوئے ہیں اُن کو سلام

ہم اپنے صف شکنوں کو سلام کرتے ہیں

دلاورانِ گرامی! صد آفریں تم پر
کہ رزم گاہ میں غالب، کوئی نہیں تم پر
ہمیشہ ناز کرے گی، یہ سرزمیں تم پر

ہم اپنے صف شکنوں کو سلام کرتے ہیں

ہلال فتح کا پرچم، بلند ہے تم سے
عظیم قوم کی عظمت، دو چند ہے تم سے
وطن کا نام و نشاں، ارجمند ہے تم سے

ہم اپنے صف شکنوں کو سلام کرتے ہیں

وقار قوم ہو تم، افتخار قوم ہو تم
جلال قوم ہو، آئینہ دار قوم ہو تم
ہے قوم تم پہ فدا، جاں نثار قوم ہو تم

ہم اپنے صف شکنوں کو سلام کرتے ہیں

تمام رہگزروں کی، دعا قبول کرو
دریچوں اور دروں کی، دعا قبول کرو
وطن کے سارے گھروں کی، دعا قبول کرو

ہم اپنے صف شکنوں کو سلام کرتے ہیں

مجاہدوں کو وطن کے تیغ وروں کا سلام
دل و نگاہ کی دنیا کے رہبروں کا سلام
تمام خوش نظروں، نکتہ پروروں کا سلام

ہم اپنے صف شکنوں کو سلام کرتے ہیں

شہید جیت گئے

شہید جیت گئے، شہسوار جیت گئے
دیارِ پاک! ترے جاں نثار جیت گئے
وفا کی تیرے لیے اے مرو جاں بازاں!
ترے جمال کے آئینہ دار جیت گئے
خزاں کی بادِ مخالف نے جن کو چھیڑا تھا
وہ تیرے سبز نشاں، اے بہار جیت گئے!
فضا نورد، ترے چھا گئے فضاؤں پہ
ترے جوان، سرِ کارزار جیت گئے
حریمِ عظمتِ اقبال تجھ کو مژدہ ہو
کہ تیرے لوگ، ترے نامدار جیت گئے

وفا ہے معجزۂ جسم و جاں سو کام آئی
ہجوم ہار گیا، کم شمار جیت گئے

ہوا ہے خونِ جگر مژدۂ فروغِ سحر
تپیدگان شبِ انتظار جیت گئے

دلوں کو تیرا سہارا بڑا سہارا تھا
غرور ہار گیا، خاکسار جیت گئے

فضا فضا ہے یہ نغمہ، نوا نوا یہ صدا
فدائیانِ سرِ کوئے یار جیت گئے

مزارِ قائدِ اعظم تجھے مبارک ہو
ہمارے شہر، ہمارے دیار جیت گئے

ہوں تیری آن کے قرباں، عاشقوں کے ہجوم
ترے نثار، ترے جاں نثار جیت گئے

سلامِ فتح

(۱۹۶۵ء کی جنگ میں کراچی کے شہداء کو خراجِ عقیدت)

سلام فتح! کراچی ترے جیالوں پہ

رہیں گے یاد جو تیور دکھائے ہیں تم نے

جلال و جوش کے منظر دکھائے ہیں تم نے

عجب کمال کے جوہر دکھائے ہیں تم نے

سلام فتح! کراچی ترے جیالوں پہ

وفا کی تم وہ ادا ہو جو دل نواز ہوئی

تمہاری حوصلہ مندی متاع ناز ہوئی

تمہاری شان فضاؤں میں سرفراز ہوئی

سلام فتح! کراچی ترے جیالوں پہ

یہ ارضِ پاک تمہیں زندگی سے پیاری ہے
اس کے واسطے ہر چیز تم نے واری ہے
تمہارے عشق کی فطرت ہی جاں نثاری ہے
سلامِ فتح! کراچی ترے جیالوں پہ

وفائیں نغمہ فشاں ہیں تمہاری گلیوں میں
جو ولولے ہیں جواں ہیں تمہاری گلیوں میں
قدم قدم دل و جاں ہیں تمہاری گلیوں میں
سلامِ فتح! کراچی ترے جیالوں پہ

استفسار

(۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء، سقوطِ مشرقی پاکستان پر)

کیا اس قدر حقیر تھا اس قوم کا وقار
ہر شہر تم سے پوچھ رہا ہے، جواب دو!
یہ بات کیا ہوئی کہ بیابانِ وقت میں
احساسِ تشنگی کو بڑھا کر سراب دو
ہم کو چمک چمک کے دکھائے گئے تھے خواب
خاموش کیوں ہو؟ اب ہمیں تعبیرِ خواب دو
جو صرفِ گلستاں نہ ہوا، رائیگاں گیا
اس خونِ شاہدانِ وفا کا حساب دو

○

ملت کے احترام کو رسوا کیا گیا
بے حوصلہ عوام کو رسوا کیا گیا
لینا تھا اس زمیں پہ شفق سے جسے خراج
اس رنگِ صبح و شام کو رسوا کیا گیا
تھیں اپنے حوصلوں کی سبیلیں جس سے عیاں
اس نظم، اس نظام کو رسوا کیا گیا
نازاں تھا جس پہ منزلِ عظمت کا افتخار
اس شوکتِ دوام کو رسوا کیا گیا
تاریخ جس کے سامنے رہتی تھی سجدہ ریز
اس عظمتِ دوام کو رسوا کیا گیا
اے غازیو! جہاد کی توہین کی گئی
اے شاعرو! کلام کو رسوا کیا گیا
جو لکھ رہے تھے خون سے تاریخ فصلِ رنگ
ان نامیوں کے نام کو رسوا کیا گیا

○

یہ پوچھتی ہیں وقت سے خوددار بستیاں
جس نے ہمیں فریب دیا ہے، وہ کون ہے؟

کس نے کیا ہے قوم کے دشمنوں کو بے وقار
جس نے ہمیں ذلیل کیا ہے، وہ کون ہے؟

○

کس نے کہا کہ ہار گئے اپنے حوصلے
ہم اپنے حوصلوں کے رجز خواں ہیں آج بھی
ہم کو شکست ولولۂ جاں نہیں قبول
ہم پاسدار ولولۂ جاں ہیں آج بھی
ہم جو لہولہان ہوئے حق کے واسطے
ہم لوحِ روزگار کا عنواں ہیں آج بھی
کھائے ہیں ہم نے زخم اٹھائے ہیں ہم نے داغ
ہم نامدارِ رنگِ بہاراں ہیں آج بھی

○

ناقابلِ شکست ہیں اس قوم کے عوام
اس قوم کے عوام کی تعظیم کیجیے
یہ قوم آج بھی ہے سرافراز و سرخرو
اس قوم کے جلال کو تسلیم کیجیے

○

مانا نہیں ہے، ہم نے غلط بندوبست کو
ہم نے شکست دی ہے، ہمیشہ شکست کو

مرہم جواب

ہیں بزمِ شب میں پڑے افشاں گماں گماں سے
گزر رہا ہے جو سال اس کے ریگاں سے

متاعِ غم بھی ہیں دھوئیں کے مرغولے
بکھر رہے ہیں الجھ کر زیاں زیاں سے

نہ زرد زرد رو ہوں کیوں وقت کے لب و رخسار
کہ سال سال گزر رہے خزاں خزاں سے

عجیب دور گزرا ہے شب نشینوں نے
ہر ایک سال کے لیے تھے بے اماں سے

شمار کیا نفس میں شمار زخم ہے
ہمارے دل کی شکستوں کے غم جہاں سے

بھگو گئے ہیں ہمارا نفس نفس خوں میں
حیات خوں شدہ تیرے وہ خونچکاں لمحے
یہ صرف عمرِ گزشتہ کی گرد ہے یا ہم
فضا میں پھیلے ہوئے ہیں دھواں دھواں لمحے

○

سیاہ سال پہ خزانِ مرگ طاری ہے
نفس نفس پہ تغیر کا حکم جاری ہے
یہ اس تباہ شدہ سال کی ہے آخری شب
کہ جس میں صرف ہلاکت ہے سوگواری ہے
تمام ہو گئی لو، انتظار کی ساعت
قریب منزلِ صبحِ امیدواری ہے
فروغِ ظلمتِ اہلِ ہوس کا دور گیا
مگر زمانِ وفا اب تمہاری باری ہے

○

وہ عہد تھا کہ مرے خواب تک نہ تھے آزاد
مرے خیال کی تنہائیوں کو شکوہ تھا

وہ بے حسی تھی، وہ سنگین بے حسی کہ یہاں
دلوں کو اور دل آرائیوں کو شکوہ تھا
مرے سخن میں نہ تھی شوقِ دید کی مستی
ترے جمال کی رعنائیوں کو شکوہ تھا
مشاہداتِ حوادث میں خفتہ تھی نگاہ
تری ادا، تری انگڑائیوں کو شکوہ تھا
غمِ حیات میں پروائے دردِ دل بھی نہ تھی
تری وفا کی مسیحائیوں کو شکوہ تھا

○

ہوا ہے کارِ طلب سلسلہ امیدوں کا
ہمیں کبھی تو ملے گا صلہ امیدوں کا

○

نظر میں عکسِ فروغِ پسِ حجاب تو ہے
نہیں یہ خواب کی تعبیر، پھر بھی خواب تو ہے
حیات، سلسلۂ امتحانِ آرزو تو ہوئی
نشاطِ شوق تو ہے، لطفِ اضطراب تو ہے
ہمارے نام سے آغازِ گفتگو تو ہوا
ادائے خاص تو ہے، التفاتِ خطاب تو ہے

شکستگاں کے لبوں پہ ہیں زخم زخم سوال
مگر یہ بات کہ اب مرہم جواب تو ہے
سراب سوختگاں سے میں اب کہیں مایوس
یہ کم نہیں ہے کہ احساس قحط آب تو ہے
فضائے حسن سماعت تو سازگار ہوئی
سو اب لبوں پہ یہاں ذکر انقلاب تو ہے

سچائیوں کے ساتھ

ذہن کا غم، ذات کا غم، ذات کے رشتوں کا غم
کتنے غم ہیں جو شعورِ زندگی کے ساتھ ہیں
اک مصیبت ہے، بلا ہے، آگہی کی روشنی
کس قدر تاریکیاں اس روشنی کے ساتھ ہیں

○

میں ہوں اک فن کار و شاعر اور میری زندگی
زندگی کے غم میں جلنے کے سوا کچھ بھی نہیں
ایک صحرا ہے مرا عہدِ جوانی اور مجھے
کام اس صحرا میں جلنے کے سوا کچھ بھی نہیں

○

میرا غم ہے میرے احساسات کی تلخی کا غم
میرے اس صبر آزما غم نے جلا ڈالا مجھے
آج بھی تو حق خف مشکل میں ہے اس احساس نے
عمر کی شاداب فصلوں میں بچھا ڈالا مجھے

○

چاٹتی ہے آج بھی انسانیت اپنا لہو
زندگی ہے آج بھی خود اپنے زخموں کا شکار
آج بھی قوموں کو دھمکاتا ہے قوموں کا غرور
ہے دلوں میں آج بھی تاریک صدیوں کا غبار

○

میں ہوں اس ملت کا شاعر جس کے حق میں سامراج
سازشوں کا زہر ہے عیاروں کا وار ہے
دشمنی نے نام رکھ چھوڑا ہے اپنا دوستی
کس قدر قاتل یہ لطف نرمِ گفتار ہے

○

حل نہ کرنے کے لیے ہر مسئلہ ہے زیرِ غور
مسئلوں کو اور الجھانے کا فن ہے سامراج
بستیاں ہیں مضطرب، آبادیاں ہیں مضمحل
ہر جا خود پروری پر زخمہ زن ہے سامراج

○

کتنے ہی غم ہیں جو ہم سودائیوں کے ساتھ ہیں
ہم جو حق کے ساتھ ہیں سچائیوں کے ساتھ ہیں